مجلس البحث العلمي
المدینہ اسلامک ریسرچ سینٹر

albayanmirc@gmail.com +92-21-35896959 www.islamfort.com

سلسلہ نمبر 20 جنوری تا مارچ 2018

مدیر اعلیٰ | فضیلۃ الشیخ ڈاکٹر خلیل الرحمن لکھوی حفظہ اللہ

مجلس علمی

فضیلۃ الشیخ ارشاد الحق اثری حفظہ اللہ
فضیلۃ الشیخ حافظ مسعود عالم حفظہ اللہ
فضیلۃ الشیخ حافظ شریف حفظہ اللہ
فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ
فضیلۃ الشیخ ابراهیم بھٹی حفظہ اللہ

مدیر
خالد حسین گورایہ

مدیر مجلس ادارت
حافظ محمد سلیم

مجلس ادارت

عثمان صفدر — فاضل مدینہ یونیورسٹی
سعید احمد شاہ — فاضل مدینہ یونیورسٹی
حماد امین چاؤلہ — فاضل مدینہ یونیورسٹی
شعیب اعظم مدنی — فاضل مدینہ یونیورسٹی
جمشید اعوان — فاضل مدینہ یونیورسٹی

بیورو چیف سندھ: عمران فیصل (فاضل مدینہ یونیورسٹی)
کمپیوٹر لے آوٹ: عبدالحمید صغیر/محمد امین شگری

زرتعاون بھیجنے کے لئے اور **البیان** کے شمارہ جات جاری کروانے کے لئے ذیل میں دیئے گئے پتہ پر بذریعہ منی آرڈر رقم ارسال کریں نیز بذریعہ ایزی پیسہ اور آن لائن بھی رقم ارسال کرسکتے ہیں۔

تفصیلات کے لیے رابطہ: محمد کامران یاسین/ 03222056928

زرتعاون شمارہ
130 روپے
سالانہ بکنگ پر خصوصی رعایت

بیرون ملک
زرسالانہ 12 ڈالر
فی شمارہ 3 ڈالر
(علاوہ ڈاک خرچ)

Bank Al-Habib A/C No:1103-0081-002746-01-2

برائے خط وکتابت: المدینہ ریسرچ سینٹر پوسٹ بکس نمبر 12231، ڈی ایچ اے، کراچی

المدینہ اسلامک ریسرچ سینٹر
AL-Madina Islamic Research Center
مسجد سعد بن ابی وقاص ڈیفنس فیز 4، 11 کمرشل اسٹریٹ
نزد شارشہید پارک وگذری پولیس اسٹیشن کراچی

Ph:+92-21-35896959
Mob 03322135693
WEBSITE:
WWW.ISLAMFORT.COM
E-MAIL
albayanmirc@gmail.com

فہرست مضامین

فکری محاذ پر اصطلاحات کی جنگ (اداریہ)	طاہر الاسلام عسکری	3
سرِ عام پھانسی، انسانی شرف ووقار کے خلاف ہے یا اس کے تحفظ کی ضامن؟	حافظ صلاح الدین یوسف	9
اللہ تعالیٰ کی حفاظت کیسے حاصل کریں؟	حماد امین چاؤلہ	18
ایک مجلس کی تین طلاقیں اور بھارتی سپریم کورٹ کو فیصلہ	حافظ صلاح الدین یوسف	31
موزوں اور جرابوں پر مسح کے احکام و مسائل	حافظ صلاح الدین یوسف	54
سجدۂ سہو اور جماعت میں شریک ہونے کا بیان	الشیخ عبد الرحمٰن عزیز	63
حائضہ عورت کا تلاوت کرنے کا مسئلہ	حافظ صلاح الدین یوسف	74
سرکاری اور پرائیویٹ ملازمین وافسران کے لیے امانت ودیانت کے حوالے سے چند ضروری نصیحتیں	تالیف: الشیخ عبد المحسن العباد حفظہ اللہ ترجمہ وتلخیص: خالد حسین گورایہ	104
بچے کی ولادت کے موقع پر پڑھی جانے والی دعائیں	حافظ محمد یونس اثری	120

فکری محاذ
پر اصطلاحات کی جنگ

طاہر الاسلام عسکری

الحمد للہ والصلاۃ والسلام علی رسول اللہ وعلیٰ آلہ وصحبہ ومن والاہ۔
عصرِ حاضر میں ہتھیاروں کی جنگوں کے مقابلے میں فکری اور نظریاتی جنگیں اس حد تک اہمیت اختیار کر چکی ہیں کہ اس کے ذریعے سے قابض سوچ کی حامل قوتیں بلا کسی لاؤ لشکر کے دوسری قوم کی تہذیب کلچر اور مذہب کو فتح کر لیتی ہیں۔ اس غزو فکری کا آغاز صلیبیوں نے کیا تھا لیکن آج تمام اقوام اس کو اپنا چکی ہیں۔ لہٰذا اسلامی ممالک میں مغربی کلچر کی یلغار بھی اسی نظریاتی جنگ میں یورپ کی فتح کا سائرن بجا رہی ہے۔ اس جنگ کیلئے یورپ نے بہت محنت کی جس کا ثمرہ وہ آج سمیٹ رہے ہیں اور ہمیں نظر آتا ہے کہ مسلمانوں کے تقریبا ہر گھر میں یورپی لباس، زبان، تہذیب وثقافت رچ بس چکی ہے۔ وہ اس سے چاہتے ہوئے بھی پیچھا نہیں چھڑا پا رہے۔ اس میدان کو فتح کرنے کیلئے مغربی مفکرین نے بہت سے طریقے اور وسائل استعمال کئے جن کی اجمالی جھلک ان نکات میں ملاحظہ فرمائیں۔

۔۔۔ اسلامی عقائد وعبادات اور مصادر ومراجع کی حیثیت کو مشکوک بنانا

۔۔۔ مسلمانوں کی معاشی ومعاشرتی زندگیوں سے مذہب کو نکال باہر کرنا

۔۔۔ جدت اور ترقی کے نام سے اسلامی اخلاق واقدار اور عفت وعصمت پر حملہ کرنا۔

۔۔۔ اسلامی اصولوں پر کاربند رہنے والوں کو انتہا پسند، ترقی کے دشمن، بنیاد پرست جیسے القابات سے نوازنا۔

۔۔۔ مسلمانوں کو ملکوں کی حدود میں محصور کر دینا کہ ایک کو دوسرے سے کوئی سروکار ہی نہ رہے۔

۔۔۔ مسلمانوں کی تاریخ کو مسخ کرنا، اس میں تحریف وتبدیلی کرنا۔

۔۔۔ حدیث وسنت کی استنادی حیثیت کو مشکوک قرار دینا وغیرہ وغیرہ

زیر نظر تحریر بھی مغربی کی فکری جنگ کے ایک محاذ کی نشادہی کر رہی ہے جسے قارئین کے استفادہ کیلئے البیان میں شائع کیا جا رہا ہے۔ واللہ ولی التوفیق (ادارہ)

جنگیں اگرچہ توپ و تفنگ سے لڑی جاتی ہیں لیکن ان کا اصل میدان عقائد و افکار کے مباحث ہیں۔ آج عالم کفر جہاں ملتِ اسلامیہ پر آتش و آہن کی بارش برسا رہا ہے وہیں اس کے تھنک ٹینکس ہمارے تصورِ زندگی اور مذہبی و معاشرتی اقدار کو بدلنے کے لیے بھی دن رات کوشاں ہیں۔

الفاظ و مصطلحات چوں کہ پوری تہذیب کی نمائندہ ہوتی ہیں، اسلیے انھیں بگاڑنے کے لیے وہ تمام تر توانائیاں صرف کر رہے ہیں؛ اس ضمن میں استعمار اور ان کے کارندوں کے یہاں مختلف اسالیب بروے کار لائے جاتے ہیں جن کا مختصر تذکرہ حسب ذیل ہے:

تلبیس: ترویج باطل کا ایک کارگر اسلوب

1 باطل کی ترویج کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اصطلاحوں کی اصل حقیقت کو مستور رکھتے ہوئے ان کے خود ساختہ مفاہیم کو رواج دیا جائے، مثلاً سیکولرزم کو فروغ دینے کے لیے اس کا یہ معنیٰ بیان کرنا کہ ”ہر ایک کو اپنے مذہب پر رہنے کی آزادی ہے اور اس پر کوئی جبر نہیں۔“ بعض سادہ لوح اس فریب کا شکار ہو جاتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ اگر اس کا یہی مطلب ہے تو ایک نئی اصطلاح کی حاجت ہی کیا ہے؟

مزید یہ کہ اہل مذہب کو یہ دھوکا دیا جائے کہ مذہب تو خود جبر کی نفی کرتا ہے، پس اس طرح اسلام خود سیکولر مذہب ہے۔ لیکن جب سیکولرزم کو منوا لیا تو پھر اصل نظام رائج کر دیا کہ مذہب کا سیاست و ریاست، آئین و قانون اور اقتصاد و معیشت سے کوئی تعلق نہیں، اور یہ کہ مذہب کو مسجد و مندر کی چار دیواری تک محدود رکھو!

اصطلاحوں کے گمراہ کن اور دل فریب تراجم

2 باطل افکار و نظریات پھیلانے کے لیے اہل باطل جو مختلف ہتھکنڈے اختیار کرتے ہیں، ان میں ایک تکنیک یہ ہے کہ تباہ کن مفاہیم کی حامل اصطلاحوں کو ایسے خوش نما الفاظ میں دوسری زبانوں میں منتقل کیا جائے کہ اصل حقیقت پوشیدہ رہے اور لوگ التباسِ فکری میں مبتلا ہو جائیں۔ مثلاً Democracy کا ترجمہ 'جمہوریت' کرنا؛ حالاں کہ جمہوریت اس کا درست ترجمہ نہیں ہے، بلکہ 'عوام کی حاکمیت' اس کا صحیح مفہوم ہے۔ اور معنویت کے لحاظ سے جمہوریت میں اکثریت کی اقلیت

پر جبری حکومت ہوتی ہے۔ اس سے یہ ہوا کہ اسلامی لٹریچر میں موجود جمہور علما کی ترکیب سے ڈیموکریسی کے جواز پر استشہاد کیا جانے لگا جبکہ دونوں میں کوئی نسبت ہی نہیں ہے۔ جمہور علما کے موقف کو قرینۂ ترجیح کے طور پر اس وقت بیان کیا جاتا ہے جب حکم شرعی کی شرح وتوضیح میں اہل علم کا اختلاف ہو جائے، جبکہ ڈیموکریسی میں شریعت کا کوئی دخل مانا ہی نہیں جاتا۔

3 اسی طرح اقوام متحدہ کی دستاویزات میں Women Empowerment کو عربی میں تمکین المرأۃ (عورت کو تمکین دینا) سے تعبیر کیا گیا تو اس پر علما نے نقد کیا اور وضاحت کی کہ اس کا صحیح ترجمہ استقواء المرأۃ بنتا ہے، یعنی 'عورت کو قوت دینا' یا قوی کرنا تاکہ وہ مردوں سے اپنے حقوق کے لیے جنگ کر سکے۔ یہ لفظ اصلاً Feminist تحریک کے ایک تصور کو بیان کرتا ہے جو اسلامی مفاہیم سے قطعی متصادم ہے۔ تمکین تو اسلام نے عورت کو پہلے ہی سے عطا کر رکھی ہے اور اس کے تمام حقوق کی مکمل نگہداشت کرتے ہوئے مردوں کو ان کی ادائیگی کا پابند کیا ہے۔

4 اسی طرح عربی زبان میں سیکولرزم کا ترجمہ العلمانیۃ کیا گیا لیکن یہ بھی بالکل غلط اور دور از کار ہے کیوں کہ یہ عربی لفظ علم سے مشتق ہے جب کہ Secularism میں علم کا کوئی مفہوم نہیں پایا جاتا۔ اس کا صحیح مفہوم 'لا دینیت' یا مذہب کو دیگر امورِ زندگی (بہ شمول سیاست، قانون، معیشت، معاشرت) سے یک قلم جدا کر دینا ہے کہ ان معاملات میں اس کا کوئی کردار نہ ہو۔

غیر اسلامی تناظرات کا مسلم تہذیب پر اطلاق

5 بعض الفاظ ایسے ہیں جو یورپ کے قرونِ مظلمہ Dark Ages میں چرچ اور دیگر طبقہ ہائے فکر کے مابین ہونے والی آویزشوں کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوئے؛ مثلاً Fundamentalist جس کا ترجمہ عربی میں الأصولیۃ اور اردو میں 'بنیاد پرستی' کیا جاتا ہے۔ یہ منفی معنوں میں مستعمل ہے کیوں کہ اس سے اہلِ کلیسا کا وہ رویہ مراد لیا جاتا ہے جو انھوں نے نئے سائنسی نظریات کے بالمقابل اپنایا کہ انھیں خلافِ مذہب قرار دے کر یکسر مسترد کر دیا جائے، حالانکہ یہ جدید نظریات اصل مذہب کے بجائے مذہب کے نام پر خود تراشیدہ مذہبی تشریحات کے خلاف تھے۔ اسلام میں ایسی کسی جنگ و پیکار کا وجود ہی پایا نہیں جاتا کہ انسانی تجربات واکتشافات اور ان کے حاصلات اصلاً دین کا موضوع

ہی نہیں ہیں؛ اس کا بنیادی محور خیر وشر اور ہدایت وضلالت کے مباحث ہیں؛ پس سائنسی نظریات سے اسلام کو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے، الّا یہ کہ سائنس کا نام لے کر غلط طور پر عقائد وایمانیات میں دخل اندازی کی کوشش کی جائے۔ اسلام میں بنیاد پسندی قابل تحسین ہے، بہ ایں معنیٰ کہ بنیادی عقائد وافکار سے وابستگی رکھی جائے اور ان سے سرِ موانحراف نہ کیا جائے۔

6 اسی طرح کا ایک لیبل Theocracy ہے جسے 'پاپائیت' کہہ کر بے تکلفی سے علما پر چسپاں کر دیا جاتا ہے۔ تھیا کریسی، دراصل مذہبی پیشواؤں Priests کے حکومت واقتدار سے عبارت ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ پوپ کا فرمایا ہوا گویا خدا کا فرمان ہے، اور مذہب وقانون وہی ہے جو اس کی زبان سے نکلے۔ اس کے برعکس اسلام میں علما کو ایسی کوئی مذہبی اتھارٹی حاصل نہیں ہے؛ دین ومذہب محض وحی وتنزیل میں محصور ہے؛ علما بھی دیگر لوگوں کی مانند اس دین پر عمل کرنے کے پابند ہیں۔ باقی علما کی تشریحات ہیں جو اجتہاد کے زمرے میں داخل ہیں اور اجتہاد جب تک اجماع (یعنی پوری اُمت کے اتفاق) میں نہ ڈھلے، اس سے علمی اختلاف کی گنجائش ہمیشہ رہتی ہے۔

مختصراً یہ کہ ایسی اصطلاحیں اسلامی تہذیب میں فِٹ ہی نہیں بیٹھتیں کہ ان کا تناظر خالصتاً دوسری تہذیب اور غیر مذہب سے جُڑا ہوا ہے جو یہاں سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔

متفقہ اسلامی اصطلاحوں میں تحریف

7 مسلمانوں میں بعض تجدد پسند دانشور، جو جانے انجانے میں استعمار کے مقاصد کو پورا کر رہے ہیں، اپنی خود ساختہ تشریحات وتعبیرات کو مسلمانوں میں مقبول بنانے کے لیے صدیوں سے مروّج مذہبی لفظیات کو نت نئے معانی پہناتے ہیں؛ یعنی لفظ پرانا اور شرح نئی! مثال کے طور پر 'سنت' کا لفظ لیجیے؛ یہ فقہ، عقیدہ اور اُصول کی معروف اصطلاح ہے اور عمومی طور پر جب کتاب وسنت کی ترکیب بولی جائے تو ہر مسلمان اس کا یہی مفہوم سمجھتا ہے کہ اس سے مراد رسول اللہ ﷺ کے اقوال وارشادات اور افعال مراد ہیں جو کتبِ حدیث میں مندرج ہیں لیکن اب بعض اربابِ فکر نے اس کے معنیٰ یہ بیان کیے ہیں کہ ''سنت سے ہماری مراد دین ابراہیمی کی وہ روایت ہے جسے نبی ﷺ نے اس کی تجدید واصلاح کے بعد اس میں بعض اضافوں کے ساتھ اپنے ماننے والوں میں دین کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے۔''

اس اصطلاح کا یہ مفہوم ہمارے مذہبی لٹریچر میں کبھی بیان نہیں ہوا؛ بنا بریں یہ نادرست ہے کیوں کہ یہ فکری التباس کا باعث بنتا ہے اور عام مخاطب اس سے وہی مراد لیتا ہے جو علماء کے یہاں معروف ہے۔ پھر اس سے وہ تمام اُمورسنت کے اطلاق سے خارج ہو جاتے ہیں جو اس تعریف پر پورا نہیں اترتے لیکن احادیث کے دفاتر میں درج ہیں اور مسلمان انھیں سنت سمجھ کر ہی ان پر عمل پیرا ہیں۔ ان اہلِ دانش سے ہماری گزارش یہ ہے کہ وہ اپنے تصورات کی تعبیر کے لیے نئے الفاظ وضع کریں تا کہ غلط فہمی کا امکان باقی نہ رہے۔

مبہم اصطلاحیں

8 بعض ایسے الفاظ اور اصطلاحیں مشہور کی جاتی ہیں جن کا مفہوم انتہائی مبہم ہوتا ہے لیکن انھیں مسلمانوں سے جوڑ دیا جاتا ہے جیسے Terrorism یا دہشت گردی۔ آج تک دہشت گردی کی کوئی جامع تعریف متعین نہیں کی جا سکی چناں چہ استعمار سے آزادی کی خاطر ہتھیار اُٹھانے والے گروہوں کو بے تامل دہشت گرد قرار دے دیا جاتا ہے جبکہ طاقت ور ملکوں کی جانب سے کم زور ممالک کی حکومتوں کو ختم کرنے کے لیے فوجی کارروائیوں کو دہشت گردی نہیں کہا جاتا۔ اسی منطق کی رو سے کشمیر میں مسلمانوں کا بھارتی فوج سے لڑنا تو دہشت گردی ہے لیکن عراق پر امریکی حملہ ہرگز دہشت گردی نہیں ہے۔

9 یہی معاملہ Extremism یا 'انتہا پسندی' کا ہے کہ عام طور سے مذہبی طبقات کو انتہا پسندی کا طعنہ دیا جاتا ہے؛ خصوصاً وہ لوگ جو اسلامی شریعت کے نفاذ کی جدوجہد میں مشغول ہوں اور شرعی قوانین پر عمل پیرا ہوں، انھیں انتہا پسند کا خطاب دیا جاتا ہے۔ لیکن اس اصطلاح کی بھی کوئی واضح اور متعین تعریف موجود نہیں ہے کہ اس کا معیار اور کسوٹی کیا ہے؟ کب کسی شخص یا گروہ کو انتہا پسند کہا جائے گا؟ اگر سیکولر اقدار و قوانین کی پابندی انتہا پسندی نہیں ہے تو مذہبی تصورات اور قواعد و ضوابط پر عمل پیرا ہونے کا مطالبہ انتہا پسندی کے دائرے میں کیوں کر داخل کیا جا سکتا ہے؟

شرعی اصطلاحوں کی گھناؤنی تشریح

مغربی میڈیا نے، جو دراصل ان کی فکری یلغار کا ایک مؤثر ترین وسیلہ ہے، آج شرعی اصطلاحوں کو بہت ہی غلط معانی پہنا دیے ہیں اور انھیں اس قدر گھناؤنے تصورات سے جوڑ دیا ہے کہ لوگ انھیں سن کر

ہی وحشت میں مبتلا ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ عام مسلمان بھی اس سے متاثر ہوئے ہیں۔ مثلاً جہاد کو دہشت گردی، خلافت کو ظالمانہ بادشاہت و موروثیت یا مذہبی پیشواؤں کی حکومت، حدود وتعزیرات کو ظلم و تشدد اور حجاب کو پس ماندگی کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ عالم یہ ہے کہ آج اچھے بھلے پڑھے لکھے مسلمان بھی یہ سوال کرتے ہیں کہ خلافت تو قبائلی معاشرے کا نظام تھا، آج اس کے قیام کی جدوجہد کا کیا فائدہ؟ بعض دانشوروں کا کہنا ہے کہ ہمیں مغرب کے توحش کو دیکھتے ہوئے ان اصطلاحوں سے دست کش ہو کر انھی کی اصطلاحیں اپنا لینا چاہییں اور خلافت کے بجائے جمہوریت کی اصطلاح کو رواج دینا چاہیے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان اصطلاحات کے حقیقی مفاہیم کو اجاگر کیا جائے اور مغرب کے اس مکروہ پراپیگنڈے کا مؤثر جواب دیا جائے۔

اصطلاحوں کی اسلام کاری

اصطلاحات کے باب میں ایک خلط یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ غیر اسلامی تہذیب سے ایک اصطلاح لے کر اس کے ساتھ اسلامی کا سابقہ لگا دیا جاتا ہے اور یوں گویا ایک کافرانہ تصور کو مشرف بہ اسلام کر لیا جاتا ہے۔ چنانچہ اسلامی اشتراکیت، اسلامی سوشلزم اور اسلامی جمہوریت، اسلامی بینکاری اسی نوعیت کی اصطلاحیں ہیں حالاں کہ یہ اسلام سے بالکل مختلف بلکہ متضاد تصورات کی عکاسی کرتی ہیں ۔ ہمیں اپنے سیاسی، معاشی اور معاشرتی افکار وتصورات کی تعبیر کے لیے اپنے اسلاف سے منقول مذہبی لٹریچر میں مستعمل لفظیات کو رواج دینا چاہیے تاکہ کفر واسلام کے نظریات میں فرق وامتیاز باقی رہے اور اسلامی عقائد التباس کا شکار نہ ہوں جیسا کہ فی زمانہ ہم بچشم سر اس کا مشاہدہ کر رہے ہیں!

حرفِ آخر: اصطلاحوں کا مسئلہ بڑی دقتِ نظر اور تعمق فکر کا متقاضی ہے۔ اربابِ علم وتحقیق کی ذمہ داری ہے کہ وہ مغربی فکر وفلسفہ اور اسلامی تہذیب کا تقابل کرتے ہوئے ان کے باہمی تضادات وامتیازات کو اجاگر کریں اور افرادِ امت کو اس فکری بحران سے نجات دلانے کے لیے اپنا کردار ادا کریں۔

(بشکریہ محدث)

سرِعام پھانسی

انسانی شرف ووقار کے خلاف ہے یا اس کے تحفظ کی ضامن؟

حافظ صلاح الدین یوسف [1]

نوٹ آج سے تقریباً رُبع صدی قبل 1991ء میں سپریم کورٹ پاکستان کے فاضل ججوں نے سرعام پھانسی کی بابت یہ کہہ کر کہ یہ انسانی شرف ووقار کے خلاف ہے، حکم امتناعی جاری کیا تھا۔ عدالت عظمیٰ کا یہ حکم کسی پاکستانی قانون کے حوالے سے نہیں تھا کیونکہ پاکستانی قانون میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ اس وقت کے فاضل ججوں کی اپنی آبزرویشن تھی، اس کی نہ کوئی قانونی بنیاد ہے اور نہ اس کی کوئی شرعی دلیل ہی ہے۔

چند مہینے قبل قصور میں ایک معصوم بچی کے ساتھ ایک درندہ صفت شخص نے جو سفا کانہ سلوک کیا تھا، اس کے پیش نظر عوام کا مطالبہ تھا کہ اس سفاک اور ظالم کو سرعام پھانسی پر لٹکایا جائے تا کہ اس کی سزا دوسرے مجرموں کے لیے عبرت ناک مثال بن جائے۔ لیکن افسوس اسلامی نظریاتی کونسل کے موجودہ چیئرمین قبلہ ایاز صاحب سمیت چاروں صوبوں نے عوام کے اس مطالبے کو مسترد کردیا۔ ظاہر بات ہے کہ ہمیں اس عوامی مطالبے کی عدم پذیرائی سے سخت صدمہ ہوا ہے کیونکہ اس کو رد کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔

بنا بریں یہ 26، 27 سال قبل کا یہ مضمون ''البیان'' میں شائع کیا جا رہا ہے تا کہ یہ واضح ہو جائے کہ سرعام پھانسی قرآن کریم کی ہدایت کے بھی مطابق ہے اور انسانی شرف ووقار کے تحفظ کی ضامن بھی۔ اور اس کو رد کرنا صرف مغربیت سے مرعوبیت کا نتیجہ ہے۔ (ص، ی)

---

[1] مشیر وفاقی شرعی عدالت، نگران شعبہ تحقیق وتصنیف المدینہ اسلامک ریسرچ سینٹر کراچی

ایمنسٹی انٹرنیشنل جیسے اداروں اور مغربی مفکّرین کے افکار وتصورات کے پھیلتے ہوئے اثرات نے معاشرے کے خطرناک مجرموں، دہشت گردوں، سفاک ڈاکوؤں اور انسان نُما قاتل درندوں کے بارے میں ہمدردی کے جذبات عام کردیئے ہیں۔ ایک اخلاقی مجرم کو سخت سزا دینے سے بہت سے لوگوں کے دِل پسیجتے ہیں، ان کی حسّ انسانیت بیدار ہوجاتی ہے اور نرمی ومحبت کے جذبات سے وہ مغلوب ووارفتہ ہوجاتے ہیں لیکن ان اخلاقی مجرموں کے دیدہ دلیرانہ اور بے رحمانہ کرتوتوں سے امن پسند شہریوں پر جو بیتتی ہے، جس طرح سہاگنوں کے سہاگ لُٹتے ہیں، معصوم بچوں سے ان کے مادّی سہارے چھن جاتے ہیں، بوڑھے والدین کو اپنی جوان اولاد سے محروم ہونا پڑتا ہے اور قوم کی بچیوں کی ردائے عصمت وتقدس تار تار ہوتی ہے۔ وہ شاید ان کو نظر ہی نہیں آتا، یا شاید یہ افراد معاشرہ جو اخلاقی مجرموں کی درندگی وبربریت کا شکار ہوتے ہیں، انسان ہی نہیں ہوتے تب ہی تو ان مفکرین اور دانشوروں کی ہمدردیاں صرف مجرمین ہی کے ساتھ ہیں، مجرمین کی خطرناک سرگرمیوں کا نشانہ بننے والوں کے ساتھ نہیں۔

اب انسانی ہمدردی نے ایک اور روپ دھارا ہے کہ دہشت گردوں اور قاتلوں کو سرعام پھانسی نہ دی جائے، کیونکہ سرِ عام پھانسی دینا یہ انسانی شرف ووقار کے خلاف ہے۔ اور سرِ عام پھانسی کے خلاف سپریم کورٹ کی طرف سے حکم امتناعی تک جاری کردیا گیا ہے۔ [1]

خامہ انگشت بہ دنداں ہے اسے کیا لکھیے
ناطقہ سر بہ گریباں ہے، اسے کیا کہیے؟

خبر میں مزید بتایا گیا ہے کہ سپریم کورٹ نے یہ فیصلہ یا حکم امتناعی کسی درخواست کو نمٹاتے ہوئے جاری نہیں کیا ہے بلکہ از خود صورتِ حال کا نوٹس لیتے ہوئے ایسا کیا ہے، کیونکہ خصوصی عدالتوں کی طرف سے دہشت گردی کے بعض خطرناک مجرموں کو سرِ عام پھانسی کی سزائیں دینے کا اعلان کیا گیا ہے اور یہ خطرہ ہے کہ اگر ان کی طرف سے دائر کردہ رحم کی اپیلیں مسترد کردی گئیں تو انہیں سرِ عام تختۂ دار پر لٹکا دیا جائے گا۔

---

[1] روزنامہ جنگ لاہور۔ 21 نومبر 1991ء

یہ خبر پڑھ کر اوّل وہلے میں تو ہمارا سارا وجود ہل گیا، دل کانپ اٹھا اور دماغ سخت کشاکش کا شکار ہو گیا کہ یا اللہ! اغواء، قتل وغارت گری اور دہشت گردی کے خطرناک مجرموں کی عزت ووقار کے تحفظ کا یہ حکم سپریم کورٹ کی طرف سے؟! یہ ماجرا کیا ہے؟ تاہم یہ پڑھ کر کچھ حوصلہ ہوا کہ اس سوال کی باقاعدہ سماعت ہو گی، چنانچہ لاہور میں یہ سماعت ہوئی اور مزید سماعت کے لئے جنوری 1992ء کی تاریخ کا اعلان کر دیا گیا۔ عدالت کے فورم پر کیا فیصلہ ہوتا ہے، ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ تاہم مناسب معلوم ہوا کہ اس بارے میں اپنے تاثرات بھی فاضل عدالت اور دیگر اہل قانون وسیاست تک پہنچائے جائیں اور احقاقِ حق کا فریضہ۔۔۔۔ چاہے اس میں ہاتھ ہی قلم ہوں۔۔۔۔ ادا کیا جائے۔

اس سلسلے میں ہمارا پہلا تاثر تو یہ ہے کہ ہماری عدالتِ عظمیٰ کے جن فاضل ججوں نے یہ حکم امتناعی جاری کیا ہے، وہ مغربی افکار وتصورات سے مرعوب ہیں۔ مغربی مفکرین کی ساری ہمدردیاں ان اخلاقی مجرموں، خطرناک قاتلوں ودہشت گردوں ہی کے ساتھ ہیں جنہوں نے معاشرے کے امن وسکون کو تہ وبالا کیا ہوا ہے، اخلاق وشرافت کی دھجیاں بکھیر رکھی ہیں اور عصمتوں کی مقدّس چادر کو تار تار کیا ہوا ہے۔ یہ مجرم چاہے کتنی ہی عورتوں کا سہاگ لُوٹ لیں، بچوں کو یتیم وبے سہارا کر دیں، بوڑھے ماں باپ کے عصائے پیری کو توڑ ڈالیں اور عصمتوں کے آبگینوں کو پاش پاش کر دیں لیکن مغربی مفکّرین کے نزدیک پھر بھی یہ مجرم، یہ ننگِ انسانیت، یہ انسانوں کے لباس میں خوں خوار بھیڑیئے اور درندوں سے بھی زیادہ درندگی وبہیمیت کا مظاہرہ کرنے والے ''معزز شہری'' ہیں ان کو زیادہ سخت سزائیں نہ دی جائیں، نہ ان کو موت کی سزا دی جائے۔ بس زیادہ سے زیادہ ان پر مالی جرمانہ عائد کر دیا جائے یا جیل خانوں میں انہیں سرکاری مہمان بنا دیا جائے۔

بالکل یہی ذہن اس حکمِ امتناعی میں کارفرما ہے جس میں سرِ عام پھانسی کو ایک شہری کی عزت اور احترام کے منافی باور کرایا گیا ہے۔ یہ صورتِ حال ہمارے نزدیک انتہائی تشویشناک ہے، جب عدالت عظمیٰ کے فاضل ججوں کی نظر میں بھی اُن مجرموں کی عزت زیادہ اہم ہے جنہوں نے معاشرے کی عزّت کو سنگینوں کے بَل پر لُوٹنے کو اپنا پیشہ بنایا ہوا ہے اور جن خون آشام درندوں کی نظروں میں انسانی جان کی اتنی بھی قدر نہیں

ہے جتنی ایک مکھی اور مچھر کی ہوتی ہے۔ تو پھر ان ججوں اور عدالتوں سے یہ امید کس طرح کی جاسکتی ہے کہ وہ مجرموں کو عبرتناک سزائیں دے کر معاشرے کے تباہ شدہ امن وسکون کو بحال کرنے میں اور مجرموں کی سرکوبی کرنے میں کوئی مؤثر کردار ادا کرسکیں گی؟

دوسرا تأثر ہمارا یہ ہے کہ مغربی افکار سے متاثر حضرات قرآن کریم اور حدیث کی واضح تعلیمات اور امت مسلمہ کے چودہ سو سالہ تواتُر وتعامل سے بھی شاید بے خبر ہیں:

قرآن کریم میں یہ بات بڑے واضح اور غیر مبہم الفاظ میں کہی گئی ہے کہ خطرناک مجرموں کو ایسے انداز میں سرِ عام سزائیں دی جائیں کہ جن سے لوگ عبرت پکڑیں، وہ سزائیں ان کے لئے دنیوی ذلّت ورسوائی کا باعث ہوں اور سزا دیتے وقت تمہارے دلوں میں ان کے لئے نرمی اور شفقت کا جذبہ نہ ہو، زنا کی سزا بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے:

﴿وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (النور:2)

''اور تمہیں ان زانیوں پر اللہ کا حکم چلانے میں کوئی ترس نہ آئے اگر تم اللہ پر اور یوم آخرت پر یقین رکھتے ہو اور اس سزا کے وقت مومنوں کا ایک گروہ دیکھنے کے لئے حاضر ہونا چاہیے''۔

قرآن کریم کی اس آیت کا واضح مطلب یہی ہے کہ زانیوں کو سرِ عام زنا کی سزا دی جائے۔ اگر غیر شادی شدہ ہیں تو انہیں سرِ عام کوڑے مارے جائیں اور شادی شدہ ہیں تو حدیثِ نبوی اور تعامل خلفائے راشدین کے مطابق سرِ عام انہیں سنگسار کیا جائے۔

چوری کی سزا قرآن کریم نے یہ بیان فرمائی ہے کہ چور کے ہاتھ کاٹ دیئے جائیں۔ یہ سزا بجائے خود ایسی ہے کہ مجسم اشتہار اور مجسم عبرت ہے۔ چوری کے جرم میں سزا یافتہ چور کس طرح لوگوں سے مخفی رہ سکتا ہے؟ اور اس کی ''عزت'' کو کس طرح محفوظ رکھا جاسکتا ہے؟ اسی لیے قرآن نے اس کے لئے بھی یہ الفاظ استعمال کیے ﴿جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ﴾ (المائدہ:38) یہ ہاتھ کاٹنا چور کے کرتوت کی سزا ہے اور اللہ

کی طرف سے عبرت ہے۔

سورۃ المائدہ آیت 33 میں محاربت کی چار سزائیں بیان کی گئی ہیں۔1 قتل،2 سولی،3 ہاتھ، پاؤں مخالف جانب سے کاٹنا یا4 جلاوطنی۔اس کے بعد فرمایا گیا: ﴿ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ﴾ (المائدہ:33)

یہ سزائیں دنیا میں رُسوائی اسی وقت ہوں گی جب سرِ عام ہوں گی، ورنہ یہ مجرم کم از کم دنیوی رسوائی سے تو بچ سکتے ہیں۔لیکن اللہ تعالیٰ انہیں دنیوی رسوائی سے بچانا نہیں چاہتا بلکہ یہ چاہتا ہے کہ انہیں سرِ عام سزائیں دے کر انہیں ذلت ورسوائی سے دوچار کیا جائے تاکہ دوسرے لوگوں کے لیے وہ عبرت بن جائیں۔

اسلام کی انہی تعلیمات کا نتیجہ ہے کہ عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لے کر آج تک امتِ مسلمہ یہی سمجھتی اور اس پر عمل کرتی آئی ہے کہ خطرناک مجرموں کی عزت ووقار کا تحفظ نہیں کرنا ہے، بلکہ انہیں سرِ عام سزائیں دے کر انہیں ذلت ورسوائی سے دوچار کرنا ہے۔اور جب بھی اور جہاں بھی اسلامی تعلیمات کے مطابق مجرموں کے ساتھ ہمدردی کے بجائے، انہیں سخت سزائیں برسرِ عام دی گئیں، ان معاشروں سے جرائم ختم ہوگئے اور بے مثال امن وسکون قائم ہوگیا، آج بھی بہت سی کوتاہیوں کے باوصف اسلامی سزاؤں کا یہ طریقہ سعودی عرب میں قائم ہے تو اس کے ثمرات وبرکات کا بھی ہر شخص مشاہدہ کرسکتا ہے۔

ان سزاؤں کو حدود بھی (حدّ کی جمع) اسی لیے کہا جاتا ہے کہ یہ سزائیں دوسرے لوگوں کو ان جرائم کا ارتکاب کرنے سے روکتی ہیں کیونکہ حدّ کے معنیٰ بھی روکنے کے ہیں۔اس لفظ (حدّ) کا اقتضاء بھی یہی ہے کہ سزائیں سرِ عام دی جائیں تاکہ انہیں دیکھ کر دوسرے لوگ جرائم کا ارتکاب کرنے سے باز رہیں۔اگر سزائیں سرِ عام نہ دی جائیں تو یہ حدّیں (سزائیں) حدّیں ہی نہ رہیں کیونکہ اس طرح ان کی افادیت ہی ختم ہوجائے گی اور یہ

جنگل میں مور ناچا، کس نے دیکھا

کی آئینہ دار بن کر رہ جائیں گی۔

اس لیے سرِ عام پھانسی یا کسی اور سزا کو شرفِ انسانیت کے خلاف باور کرانا اور اس کی بابت یہ تاثر دینا کہ اس طرح مجرموں کی عزت مجروح ہوتی ہے، یہ نظریہ اسلام کی تعلیمات کے صریح خلاف ہے۔

تیسری بات یہ کہ فاضل عدالتیں اگر از خود بھی معاملات اور حالات کا جائزہ لے کر فیصلے اور احکام صادر کر سکتی ہیں جیسا کہ زیر بحث مسئلے میں اس نے کیا ہے۔ اور یہ یقیناً اس نے تب ہی کیا ہے کہ وہ فی الواقع ایسا کرنے کی قانوناً مجاز ہیں۔ تو ہم فاضل عدالت کے ججوں بالخصوص عدالتِ عظمیٰ کے محترم ارکان سے یہ پوچھنا چاہیں گے کہ ہمارے ملک کے آئین میں جس طرح انسانی حقوق کے بارے میں کچھ دفعات ہیں جن کی بنیاد پر حکمِ امتناعی جاری کیا گیا ہے، اسی طرح بہت سی دفعات اسلام کے بارے میں بھی ہیں۔ بالخصوص قراردادِ مقاصد آئین کا حِصّہ بنا دینے کے بعد تو اسلام کی سمت بہت زیادہ نمایاں ہوجاتی ہے لیکن اس کے باوجود ہمارے ملک میں اجتماعی اور انفرادی دونوں سطحوں پر اسلام کو دیوار سے لگانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ کروڑوں مسلمانوں کی خواہشات پامال اور ان کے اسلامی جذبات کا خون کیا جا رہا ہے اور اسلامی اقدار و روایات کے برعکس غیر اسلامی اقدار و روایات کو بڑی تیزی کے ساتھ فروغ دیا جا رہا ہے جب کہ آئین کی رُو سے اور بالخصوص قراردادِ مقاصد کی رُو سے حکومتِ پاکستان اسلامی تعلیمات کے فروغ اور اسلامی اقدار و روایات کے احیاء و نفاذ کی پابند ہے۔

کیا ہماری عدالتوں اور ان کے فاضل ججوں کو قول و عمل کا یہ کھلا تضاد نظر نہیں آتا؟ کیا حکومتوں کا یہ مسلسل طرزِ عمل اور اسلام سے باغیانہ طریقہ آئینِ پاکستان کی کسی بھی شق اور دفعہ کے خلاف نہیں ہے؟ اگر ہے اور یقیناً ہے تو کیا وہ از خود اسی طرح ان اسلامی دفعات کی رُو سے، جو آئین میں موجود ہیں۔ حکومت کی یا اور بعض مستحکم اداروں کی ان پالیسیوں کے بارے میں کوئی فیصلہ صادر نہیں فرما سکتے جو اسلامی تعلیمات سے سراسر انحراف پر مبنی ہیں اور جن کی وجہ سے اس ملک میں اسلامی اقدار و روایات کا جنازہ نکل رہا ہے۔ مثال کے طور پر اخبارات جو الحاد اور فحاشی پھیلا رہے ہیں اور مسلمانوں کی نوجوان نسل کو جس طرح اسلام سے دُور کر رہے ہیں اور بالکل اسی طرح سے پاکستان ٹیلی ویژن اور امریکی ٹیلی ویژن اور دیگر ٹی وی چینلز بھی

زیادہ مؤثر طریقے سے یہ کام کر رہے ہیں، کیا اخبارات اور دونوں قسم کے ٹیلی ویژنوں کا یہ کردار آئین کی کسی دفعہ کے خلاف نہیں ہے؟ کیا آئین اس امر کی اجازت دیتا ہے کہ حکومت یا کوئی اور ادارہ اسلامیانِ پاکستان کی خواہشات کے برعکس اس ملک میں اسلامی تہذیب کی بجائے مغرب کی حیا باختہ تہذیب کو فروغ دے، مسلمان لڑکیاں سرِ عام ناچیں اور گائیں اور ان کی تصویریں اخبارات اور ٹی وی پر گھر گھر دکھائی اور پہنچائی جائیں؟ وعلیٰ ہذا القیاس اس طرح اور بھی کئی اہم اقدامات اور پالیسیاں ہیں جو آئین میں درج اسلامی دفعات کے خلاف ہیں۔

کیا فاضل عدالتوں کے ارکان کی یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ اگر وہ ازخود ان کا جائزہ لے کر ان کے خلاف حکم امتناعی جاری کر سکتے ہیں تو وہ عنداللہ سرخروئی حاصل کرنے کے لیے اپنے ان اختیارات کو بروئے کار لائیں، بصورت دیگر وہ بھی حکمرانوں اور بدی پھیلانے والوں کے ساتھ مجرم ٹھہرائے جا سکتے ہیں۔

ایک قابل غور بات یہ ہے کہ جدید اربابِ فکر ودانش کے نزدیک انسانیت یا ''انسانی حقوق'' کی تعریف کیا ہے؟ یہی تعریف ہے جو مغربی مفکرین کرتے ہیں؟ یا اس کا وہ مفہوم معتبر ہے جو اسلامی تعلیمات سے واضح ہوتا ہے۔ اگر انسانی حقوق کا مطلب ان کے نزدیک وہ ہے جو مغربی مفکرین لیتے ہیں اور جس کو سامنے رکھ کر ہی سرِ عام پھانسی کو انسانی وقار اور احترام کے منافی قرار دیا گیا ہے، تو پھر محترم! مسئلہ صرف سرِ عام پھانسی ہی کا نہیں رہے گا، پھر تو سزائے موت بھی بجائے خود، چاہے کال کوٹھری کے اندر ہی ہو، انسانی وقار کے خلاف ہوگی، سزائے رجم بھی انسانیت کے خلاف ہوگی، ہاتھ پیر کاٹنا بھی ظلم ووحشت کا مظاہرہ ہوگا اور کوڑے مارنا بھی انسانیت کی تذلیل ہوگی، جیسا کہ اسلامی سزاؤں کے بارے میں اہل مغرب اور مغرب زدہ ان کے مشرقی شاگرد یہی کچھ کہتے ہیں اور اسی لیے ان سزاؤں کا مغرب میں وجود نہیں ہے۔ تو کیا ہمارے یہ دانشور بھی اسلام کی ان سزاؤں کو ظالمانہ ووحشیانہ ہی سمجھتے ہیں؟ جس مغربی فلسفہ وفکر کے تحت سرِ عام پھانسی سے انسانی وقار مجروح ہوتا ہے، وہ فکر وفلسفہ تو تمام ہی اسلامی سزاؤں (حدود) کو شرفِ انسانیت کے منافی اور ظالمانہ ووحشیانہ گردانتا ہے۔ (والعیاذ باللّٰہ)

علاوہ ازیں ''انسانیت'' کے ان مغربی چیمپینوں کے نزدیک عصمت دری انسانیت یا انسانی حقوق کے منافی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب میں زنا (عصمت دری) بالرضاء سرے سے جُرم ہی نہیں ہے۔ زنا کاری ان کے نزدیک اس وقت جرم ہے جب اس میں جبر کا پہلو شامل ہو۔ اسی طرح چوراہوں، سڑکوں اور عام شاہراہوں پر مردوزن کا بوس وکنار جیسی قبیح حرکتیں بھی ان کے نزدیک عین تہذیب ہے کیونکہ یہ سارے کام باہمی رضامندی سے ہی ہوتے ہیں۔ اسی طرح کتنا بھی اخلاق سے گرا ہوا کام ہو، وہ عورت اور مرد وہاں بلا کسی ادنیٰ حجاب کے کر سکتے ہیں۔ اس میں حکومت یا معاشرہ کو دخل اندازی کی اجازت نہیں کیونکہ یہ مداخلت ان کے نزدیک انسان کے بنیادی حقوق میں مداخلت ہوگی۔

ہم پوچھتے ہیں کہ کیا ''انسانیت'' ''انسانی حقوق'' یا ''بنیادی حقوق'' کا یہ تصور صحیح ہے؟ اگر صحیح ہے تو کیا مغربی معاشرے کی مذکورہ لعنتیں ہماری عدالتوں کے نزدیک جائز متصور ہوں گی؟ اور اگر یہ مفہوم صحیح نہیں ہے تو پھر سرِ عام پھانسی کو انسانیت اور انسانی احترام کے منافی کیوں کر سمجھا جا سکتا ہے؟ اور ہماری عدالتِ عظمیٰ کے فاضل ججوں نے سرِ عام پھانسی کے خلاف ازخود حکمِ امتناعی جاری کرنے کی ضرورت کیوں محسوس کی ہے؟

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

فاضل عدالت نے ایک سوال یہ پوچھا ہے کہ برسرِ عام پھانسی سے جرائم میں کمی ہوئی ہے یا اضافہ؟ ہمارے خیال میں یہ سوال اس لیے بے محل ہے کہ پاکستان میں صحیح معنوں میں سرِ عام پھانسیاں دینے کا اہتمام ہی نہیں ہوا ہے۔ سالوں بعد کسی ایک شخص کو پھانسی پر لٹکا دینا کوئی معنیٰ نہیں رکھتا جب کہ جرائم، اغوا اور قتل ودہشت گردی کی وارداتیں روز افزوں ہیں۔ اس حساب سے سرِعام پھانسیوں کا قطعاً کوئی اہتمام ہی آج تک نہیں کیا گیا ہے۔

ورنہ واقعہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ مجرموں کی بابت یہ حکم دیتا ہے کہ انہیں دنیا میں ذلیل ورُسوا کرو اور انہیں ایسی سزا دو جو دوسرے لوگوں کے لیے عبرت ناک ہو۔ تو خطرناک مجرموں، قاتلوں اور اغوا کنندگان کو سرِ عام سُولی پر لٹکانا عین منشائے الٰہی ہے اور ہم سرِ عام سزاؤں کا مسلسل صحیح معنوں میں اہتمام کریں تو ہمارا ایمان ہے کہ اس طرح کرنے سے یقیناً مجرموں کی حوصلہ شکنی ہوگی، جرائم میں حیرت انگیز کمی ہوگی اور معاشرہ امن وسکون کا سانس لے گا۔

سعودی عرب میں اسلامی تعلیمات اور تعاملِ امت کے مطابق آج بھی سرِ عام سزاؤں کا اہتمام ہے تو اس کے نتائج وہاں ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔ ہر شخص وہاں جا کر دیکھتا ہے کہ دوکانوں میں لاکھوں روپوں کا سامان پڑا ہوا ہے لیکن دوکاندار اپنی دکانیں کُھلی چھوڑ کر نمازیں پڑھنے کے لئے چلے جاتے ہیں، راتوں کو لوگ امن وسکون کے ساتھ سوتے ہیں، بلاخوف وخطر بادیہ پیمائی وصحراء نوردی کرتے ہیں اور تنِ تنہا دور دراز کا سفر کرتے ہیں۔ کسی کو چوری کا خطرہ ہوتا ہے نہ لوٹ مار کا، اغوا کا خوف ہوتا ہے نہ دہشت گردی کا، ڈاکہ زنی کا اندیشہ ہوتا ہے نہ سلب ونہب کا۔

یہ کس قانون کی برکت ہے؟ یہ کسی انسانی قانون کی برکت نہیں، انسانوں کے خود ساختہ معیارِ انسانیت کی برکت نہیں۔ یہ صرف قانونِ الٰہی کی برکت ہے، یہ اس معیار شرف وتکریم کی برکت ہے جو اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا ہے، جس میں مجرموں کے لیے شرفِ انسانیت کی دہائی نہیں ہے بلکہ اس میں مجرموں کو جسدِ معاشرہ کا ناسور، پھوڑا اور زہر قاتل قرار دیا گیا ہے اور انسانی معاشرے کو صحت مند رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ معاشرے کے ان ناسُوروں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا جائے، ورنہ یہ فاسد مواد پورے معاشرے کو خراب کر دے گا، جس کا مشاہدہ ہم اپنے معاشرے میں کر رہے ہیں۔

بنابریں ہمارے نزدیک یہ سوال کہ سرِ عام پھانسیوں سے جرائم میں کمی ہوئی ہے یا اضافہ؟ ایک تو بے محل ہے کیونکہ ہمارے ملک میں ابھی تک اس کا صحیح معنوں میں اہتمام ہی نہیں ہوا ہے؟ دوسرا یہ سوال ایمان کی کمزوری کی غمازی کرتا ہے ورنہ جس کا اللہ کی کتاب پر صحیح ایمان ہو، اس کو اس بات کا پختہ یقین ہوتا ہے کہ اللہ کی کتاب پر عمل کرنے میں فلاح ہی فلاح ہے اور جب اللہ تعالیٰ نے سرِ عام سزاؤں کو پسند فرمایا ہے تو یقیناً سزاؤں کا یہ طریقہ نہ صرف یہ کہ انسانی معاشروں کے امن وسکون کا ضامن ہے بلکہ یہ شرف ووقارِ انسانیت کا محافظ بھی ہے نہ کہ انسانی شرف کے منافی جیسا کہ مغرب زدہ حضرات کا نقطۂ نظر ہے۔

بہر حال جس لحاظ سے بھی زیر بحث حکم امتناعی کو دیکھا جائے، محل نظر ہی نظر آتا ہے اور کہنا پڑتا ہے۔

اے اہل نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ سمجھے وہ نظر کیا

اللّٰہ تعالیٰ
کی حفاظت کیسے حاصل کریں؟

اللہ کی پناہ اوراس کی حفاظت میں آنے کے ذرائع ، وسائل اورادعیہ واذ کار پر مشتمل
ایک جامع تحریر

حماد امین چاؤلہ [1]

الحمدُ للہ والصلوٰۃ والسلام علی رسول اللہ وعلیٰ آلہ وصحبہ وازواجہ ومن والاہ وبعد!

تفسیرِ تعوّذ: أَعُوْذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

ہم سب کو یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ شیطان ہمارا ازلی دشمن ہے جس نے نا صرف ہمارے والدین آدم وحوّا علیہما السلام کو جنت سے نکلوایا (سورُ البقرۃ:35، 36) بلکہ اُس نے اللہ کی عزّت کی قسم بھی کھائی ہے کہ وہ ہم سب (اولادِ آدم) کو ہدایت کے راستے سے بھٹکاتے ہوئے گمراہ و بے راہ روی میں مبتلا کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے گا۔

چنانچہ فرمان باری تعالیٰ ہے:﴿قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ، إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ﴾

[1] نائب مدیر المدینہ اسلامک ریسرچ سینٹر

ترجمہ: ''(شیطان) کہنے لگا پھر تو تیری عزّت کی قسم میں ان سب (بنی آدم) کو یقیناً بہکا دوں گا سوائے تیرے مخلص بندوں کے۔'' (ص:82-83)

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابِ ہدایت قرآن حکیم میں ہمیں شیطان، اُس کے چیلوں اور چالوں سے دور رہتے ہوئے اُس سے بچنے کا حکم دیا (البقرۃ:208) اور ایسی تدابیر بیان فرمائیں کہ جن کے ذریعہ ہم خود کو اللہ کی پناہ وحفاظت میں دیتے ہوئے شیطان مردود سے خود کو محفوظ رکھ سکیں۔ انہی تدابیر میں سے ایک اہم تدبیر ''تعوّذ'' کو جاننا، سمجھنا اور عملی طور پر اُسے اپنانا ہے جس کی تفصیلات کو آسان اور مُختصر انداز میں اس مضمون میں جمع کیا گیا ہے۔ اللہ ہمیں سمجھنے اور عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

تعوذ کی تعریف: تعوّذ عربی زبان میں ایک اصطلاح ہے جس کا ''لفظی'' معنی ہے:

''دور رہنا، بچنا، پناہ مانگنا، خود کو کسی کی حفاظت و پناہ میں دینا، کسی کی حفاظت و پناہ میں آنا۔''[1]

اور اسی معنی میں عربی میں ایک اور کلمہ: ''استعاذہ'' بھی استعمال ہوتا ہے۔

اور شریعتِ مطہّرہ میں اس اصطلاح سے مراد:

''صرف ایک اللہ تعالیٰ کی پناہ وحفاظت طلب کرنا۔ شیطان مردود سے اور ہر نقصان وشر والی بات، حالات اور مخلوق کے شر ونقصان اور وسوسہ وغیرہ سے۔''[2]

اللہ کی پناہ کیسے اور کب حاصل ہو گی؟

یہاں یہ بات بھی سمجھنا ضروری ہے کہ انسان کو اللہ کی حفاظت و پناہ اُس وقت حاصل ہو گی جب اُس میں مندرجہ ذیل چار باتیں موجود ہوں گی:

1. انسان پہلے تو اس بات کا پختہ عقیدہ ونظریہ رکھے کہ اس پوری کائنات میں صرف ایک اللہ ربّ العزّت

---

[1] لسان العرب، مادة: عوذ

[2] (دیکھیے: بدائع الفوائد (426/2)، اغاثة اللهفان: (91/1) للامام ابن القیم، تفسیر ابن کثیر (16/1)، مرقاة المفاتیح (448/2)، عون المعبود (131/2))

ہی وہ قادر مطلق ہے کہ جو ہر ایک کو ہر وقت ہر طرح سے بچانے، حفاظت کرنے اور پناہ دینے پر قدرت رکھتا ہے اور اُس کے علاوہ کوئی بھی ذات و شئے خواہ وہ انبیاء ورسل ہوں، مقرّب فرشتے ہوں، جن ہوں یا کوئی پیر و مُرشد ہوں یا کوئی حجر و شجر وغیرہ اللہ جل جلالہ کے علاوہ کوئی بھی کسی کی حفاظت کرنے یا کسی کو پناہ دینے پر قادر نہیں۔

2 اسی طرح وہ یہ بھی پُختہ عقیدہ رکھے کہ کوئی بھی انسان اللہ کے حکم و مشیئت کے بغیر خود اپنے بل بوتے و طاقت و اختیارات کی بناء پر خود کو کسی بھی شر و نقصان سے نہیں بچا سکتا لہٰذا ہر انسان اللہ کی حفاظت و پناہ کا محتاج ہے۔

3 اس کے بعد وہ انسان اپنی جان، مال، عزّت و آبرو سب کچھ اللہ کے سپرد کردے، اس طور پر کہ اللہ ہی پر بھروسہ کرے، اُسی سے ہی امید لگائے اور اُسی سے ہی ڈرے۔

4 پھر وہ اللہ کی حفاظت و پناہ طلب کرنے کا مسنون (قرآن کریم و سنّتِ نبویہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت شدہ) انداز و طریقہ اختیار کرے جس کا ذکر اگلی سطور میں آرہا ہے۔ (ان شاء اللہ)

(ان چاروں باتوں پر عمل کرتے ہوئے) پھر وہ اللہ کی حفاظت و پناہ طلب کرے تو اُسے یقیناً اللہ کی مکمّل حفاظت و پناہ حاصل ہوگی ان شاء اللہ۔

فرمانِ الٰہی ہے: ﴿فَاللَّهُ خَيْرٌ حَافِظًا وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ﴾ (سورہ یوسف: 64)۔ کہ ”اللہ ہی بہترین حفاظت کرنے والا ہے اور وہ سب مہربانوں سے بڑا مہربان ہے“۔ اور فرمایا: ﴿حَتَّىٰ إِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ أَنفُسُهُمْ وَظَنُّوا أَن لَّا مَلْجَأَ مِنَ اللَّهِ إِلَّا إِلَيْهِ﴾ (التوبہ: 118)

ترجمہ: ”حتیٰ کہ زمین اپنی فراخی کے باوجود ان پر تنگ ہوگئی اور ان کی اپنی جانیں بھی تنگ ہوگئیں اور انہیں یہ یقین ہوگیا کہ اللہ کے سوا ان کے لئے کوئی جائے پناہ نہیں۔“

تعوّذ (اللہ کی پناہ حاصل کرنے) کے الفاظ اوقات اور مقامات

تعوّذ (اللہ کی پناہ حاصل کرنے) کے الفاظ

تعوّذ کے لئے مختلف الفاظ قرآن کریم اور احادیثِ مبارکہ میں وارد ہوئے ہیں۔

1 سب سے مشہور و مختصر الفاظ ہیں: ''اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ''

ترجمہ: ''میں پناہ میں آتا ہوں اللہ کی شیطان مردود سے۔''

فرمانِ الٰہی ہے: ﴿فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ﴾ (سورۃ النحل:98)

ترجمہ: ''قرآن پڑھنے کے وقت راندے ہوئے شیطان سے اللہ کی پناہ طلب کرو۔''

2 کچھ اضافے کے ساتھ یہ الفاظ ہیں: ''اَعُوْذُ بِاللّٰہِ السَّمِیعِ العَلِیمِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ''

ترجمہ: ''میں پناہ میں آتا ہوں اللہ کی جو سب کچھ سننے جاننے والا ہے شیطان مردود سے۔''

3 اور اس سے بھی جامع الفاظ ہیں:

''أَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنْ الشَّیْطَانِ الرَّجِیمِ مِنْ هَمْزِهِ وَنَفْخِهِ وَنَفْثِهِ''۔[1]

4 اور سب سے جامع الفاظ ہیں: ''أَعُوذُ بِاللّٰہِ السَّمِیعِ الْعَلِیمِ مِنْ الشَّیْطَانِ الرَّجِیمِ مِنْ هَمْزِهِ وَنَفْخِهِ وَنَفْثِهِ'' ''میں اللہ ربّ العزّت کی پناہ مانگتا ہوں جو (ہر ایک کی) سننے اور جاننے والا ہے۔ شیطان مردود سے، اس کے وسوسوں، اس کے تکبر اور اس کی جھاڑ پھونک سے۔''

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز کی پہلی رکعت کی ابتداء میں دعائے استفتاح کے بعد اور تلاوت سے پہلے یہی تعوّذ پڑھتے تھے۔[2]

---

[1] أبو داود: کتاب الصلاة، باب ما یستفتح به الصلاة من الدعاء۔(764)، ابن ماجه: کتاب إقامة الصلاة، باب الاستعاذة في الصلاة: (807)، اس حدیث کو امام البانی رحمہ اللہ نے صحیح قرار دیا ہے، دیکھیے: الإرواء (2/54))

[2] أبو داود: کتاب الصلاة، باب من رأى الاستفتاح بسبحانك اللهم بحمدك (755)۔ الدارمی (1219)، اس حدیث کو امام البانی رحمہ اللہ نے حسن قرار دیا ہے۔ دیکھیے: الإرواء (2/54)

5 اس کے علاوہ قرآن کریم کی دو آخری سورتیں سورۃ الفلق اور سورۃ الناس کو بھی رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مُعوَّذتَین (وہ دو سورتیں کہ جن کے ذریعہ اللہ کی پناہ طلب و حاصل کی جاتی ہے) قرار دیا ہے۔ بہت سی احادیث اس سلسلے میں وارد ہیں۔

6 اس کے علاوہ مختلف موقعوں پر مختلف الفاظ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تعوّذ کے اذکار وظائف ملتے ہیں جنہیں اُن مخصوص اوقات و اماکن میں ادا کرنا چاہیے جن کا ذکر ذیل میں آرہا ہے:

تعوّذ (اللہ کی پناہ حاصل کرنے) کے اوقات و مقامات

عقائد میں شیطانی وسوسے آنے پر

بسا اوقات شیطان انسان کے دل میں ایسے وساوس ڈالتا ہے کہ تمام مخلوقات کو اللہ نے پیدا فرمایا تو پھر (معاذ اللہ) اللہ کو کس نے پیدا کیا ہے؟ اسی طرح عقیدہ کے حوالہ سے مختلف شکوک و شبہات انسان کے دل میں ڈالتا ہے اس کا علاج تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ تجویز فرمایا ہے کہ: ''جب دل میں ایسے وسوسے پیدا ہوں تو یہ دعا پڑھو: '' اللَّهُ أَحَدٌ اللَّهُ الصَّمَدُ لَمْ يَلِدْ وَ لَمْ يُولَدْ وَ لَمْ يَكُن لَّهُ كُفُوًا أَحَدٌ ''ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ ایک (ہی) ہے اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے نہ اس سے کوئی پیدا ہوا نہ وہ کسی سے پیدا ہوا اور نہ کوئی اس کا ہمسر ہے۔'' پھر فرمایا: بائیں طرف تین بار ہلکا سا تھتکارو اور شیطان کے شر سے اللہ کی پناہ طلب کرو، یعنی: ''اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ'' پڑھو۔[1]

تلاوتِ قرآن کریم سے پہلے

فرمانِ الٰہی ہے: ﴿فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ﴾ (سورۃ النحل:98)

ترجمہ: ''قرآن پڑھنے کے وقت راندے ہوئے شیطان سے اللہ کی پناہ طلب کرو۔'' قرآن مجید کی تلاوت سے پہلے پوری تعوّذ پڑھی جائے تا کہ عبادت میں شیطانی مداخلت ختم ہو جائے۔

---

[1] ابوداؤد، کتاب السنة، باب الجهمية، حديث 4722

نماز میں دعائے استفتاح پڑھنے کے بعد

رسول اکرم ﷺ جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو نیت باندھ کر دعائے استفتاح پڑھتے۔ پھر تین بار "لا الہ الّا اللہ" پڑھتے پھر "أَعُوذُ بِاللهِ السَّمِيعِ الْعَلِيمِ مِنْ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ مِنْ هَمْزِهِ وَنَفْخِهِ وَنَفْثِهِ"۔ پڑھتے تھے۔

ترجمہ "میں اللہ ربّ العزّت کی پناہ مانگتا ہوں جو ہر ایک کی خوب سننے اور جاننے والا ہے۔شیطان مردود سے، اس کے وسوسوں، اس کے تکبر اور اس کی جھاڑ پھونک سے۔"[1]

نوٹ: نماز کی پہلی رکعت کی ابتداء میں اور تلاوتِ قرآن سے پہلے جو تعوّذ پڑھا جاتا ہے اس میں اَعُوْذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ کے الفاظ نبی کریم ﷺ سے ثابت نہیں ہیں جیسا کہ علّامہ البانی رحمہ اللہ تمام المنّۃ(176) میں فرماتے ہیں: مجھے (تعوّذ کے) یہ الفاظ کتبِ حدیث میں کہیں نہیں ملے سوائے "مراسیلِ ابی داؤد" کے کہ جس میں ضعیف سند سے یہ الفاظ موجود ہیں لیکن اس میں بھی نماز کا ذکر نہیں ہے اور "إرواء الغليل"(53/2) میں فرماتے ہیں: میرے علم میں اس کی کوئی اصل موجود نہیں ہے۔

البتہ نبی کریم ﷺ سے جو الفاظ ثابت ہیں وہ یہ "أَعُوذُ بِاللهِ السَّمِيعِ الْعَلِيمِ مِنْ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ مِنْ هَمْزِهِ وَنَفْخِهِ وَنَفْثِهِ" کے ہیں۔ لیکن عمومی مقامات پر "اَعُوْذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ" کے کلمات بطورِ تعوّذ کے پڑھے جا سکتے ہیں)۔

نماز میں آخری تشہّد میں سلام پھیرنے سے پہلے

فرمانِ رسول ﷺ ہے: "جب تم میں سے کوئی (نماز میں آخری) تشہّد میں ہو تو چار چیزوں سے اللہ کی پناہ مانگے: (یوں کہے:)

[1] جامع الترمذی، کتاب الصلاۃ، باب مایقول عند افتاح الصلاۃ، حدیث:242

"اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ جهنَّمَ ، وَمِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ ، وَمِنْ فِتْنَةِ الْمَحْيَا وَالْمَمَاتِ ، وَمِنْ شَرِّ فِتْنَةِ الْمَسِيحِ الدَّجَّالِ۔"[1]

ترجمہ:"اے اللہ! میں تیری پناہ میں آتا ہوں جھنم کے عذاب سے، قبر کے عذاب سے، زندگی اور موت کے فتنہ سے اور مسیح دجّال کے فتنے سے۔"

نیز صحیح بخاری میں دو مزید چیزوں سے پناہ طلب کرنے کا ذکر ہے:"اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الْمَأْثَمِ وَالْمَغْرَمِ۔"

ترجمہ:"اے اللہ! میں تیری پناہ میں آتا ہوں، گناہ اور قرض سے۔"[2]

وسوسوں کے وقت

فرمانِ الٰہی ہے:﴿وَإِمَّا يَنزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ إِنَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ﴾(الاعراف:200)

ترجمہ:"اگر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو کوئی وسوسہ شیطان کی طرف سے آنے لگے تو اللہ کی پناہ مانگ لیا کیجئے بے شک وہ خوب سننے اور جاننے والا ہے۔"

اور فرمایا:﴿وَقُل رَّبِّ أَعُوذُ بِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِينِ وَأَعُوذُ بِكَ رَبِّ أَن يَحْضُرُونِ﴾۔

ترجمہ:"آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی) یہ (دعا) مانگیں کہ اے میرے رب! میں شیطانی وسوسوں سے اور شیاطین کے میرے قریب آنے سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔" (المومنون:97 تا 98)

اور فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے:"جسے نماز میں یا نماز کے باہر شیطانی وسوسے آئیں وہ اللہ کی پناہ مانگے یعنی شیطان سے "اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ" پڑھے اور بائیں طرف تین بار ہلکا سا تھتکار دے۔"[3]

---

[1] صحیح مسلم،کتاب الصلاۃ،باب ما یستعاذ منه فی الصلاۃ،حدیث:588

[2] صحیح بخاری،کتاب الآذان،باب الدعاء قبل السلام،حدیث:832

[3] صحیح بخاری،حدیث:3276۔ صحیح مسلم،،حدیث:134

شرعی دم کرتے ہوئے اور بچوں کو اللہ کی پناہ وحفاظت میں دیتے وقت

نبی کریم ﷺ اپنے نواسے سیدنا حسن وحسین رضی اللہ عنہما کو (دم فرماتے اور) ان الفاظ (دعا) میں اللہ کی پناہ میں دیتے: ''أُعِيذُكُمَا بِكَلِمَاتِ اللهِ التَّامَّةِ من كل شَيْطَانٍ وَهَامَّةٍ وَمِنْ كل عَيْنٍ لاَمَّةٍ۔'' [1]

ترجمہ: ''میں تم دونوں کو ہر شیطان موذی (تکلیف دہ) جانور اور ہر نظرِ بد سے اللہ کے مکمل کلمات کے ذریعہ (اُس کی) پناہ میں دیتا ہوں۔''

اور نبی کریم ﷺ فرماتے ہے کہ: ''تمہارے والد (اللہ کے رسول) ابراھیم علیہ السلام ان کلمات کے ذریعہ (اپنی اولاد) اسماعیل واسحاق علیہما السلام کو (اللہ کی) پناہ میں دیتے تھے''[2]

نوٹ: ان کلمات کے ذریعہ دم کرتے وقت اس بات کا خیال رکھیں کہ اگر بچہ ایک ہو تو لڑکے کے لیے ''أُعِيْذُكَ''، اور لڑکی کے لیے ''أُعِيْذُكِ''، دو ہوں تو ''أُعِيذُكُمَا''، اور دو سے زیادہ ہوں تو ''أُعِيذُكُمْ'' پڑھا جائے۔ نیز اگر وہ سامنے موجود نہ ہوں تب بھی ''أعيذهم'' پڑھ کر ان پر دم کیا جاسکتا ہے۔

گھر سے نکلتے وقت

رسول اللہ ﷺ جب گھر سے نکلتے تو اپنی نگاہوں کو آسمان کی طرف اٹھاتے اور یہ دعا فرماتے:

'' اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ أَنْ أَضِلَّ أَوْ أُضَلَّ ، أَوْ أَزِلَّ أَوْ أُزَلَّ ، أَوْ أَظْلِمَ أَوْ أُظْلَمَ ، أَوْ أَجْهَلَ أَوْ يُجْهَلَ عَلَيَّ''۔ [3]

ترجمہ ''اے اللہ! میں تیری پناہ میں آتا ہوں اس بات سے کہ میں گمراہ ہو جاؤں یا گمراہ کر دیا جاؤں، میں پھسل جاؤں یا پھسلا دیا جاؤں، میں ظلم کروں یا مجھ پر ظلم کیا جائے، میں (کسی کے ساتھ) نادانی وجہالت کروں یا میرے ساتھ نادانی وجہالت کی جائے۔''

---

[1] ابو داؤد، کتاب السنة، باب فی القرآن، حدیث:4737

[2] جامع الترمذی، کتاب الطب عن الرسول اللہ ﷺ، حدیث:2060

[3] ابوداؤد و صححه الالبانی، کتاب الأدب، باب مایقول إذا خرج من بيته، حديث:5094

بیت الخلا میں جاتے وقت

''اللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ۔''[1]

ترجمہ: ''اے اللہ میں تیری پناہ میں آتا ہوں خبیث (جنوں) اور خبیث (جنیوں) سے۔''

غصہ کے وقت

ایک موقع پر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے دو آدمی جھگڑنے لگے حتی کہ غصہ کی وجہ سے اُن میں سے ایک شخص کا چہرہ سرخ اور نتھنے پھول رہے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں ایک ایسا کلمہ جانتا ہوں یہ اگر اُسے پڑھے لے تو اس کا غصہ ختم ہوجائے گا اور وہ کلمہ یہ ہے: ''اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ۔''[2]

بُرا یا ڈراونا خواب آنے پر

فرمانِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے: ''جب کوئی بُرا خواب دیکھے تو اُسے چاہیے کہ بُرے خواب سے اللہ کی پناہ مانگے'' (یعنی: اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْم پڑھے) اور بائیں طرف ہلکا سا تھکار دے تو بُرے خواب سے اُسے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔[3]

نیند میں یا کبھی بھی گھبراہٹ یا وحشت کے وقت

نیند میں یا کبھی بھی گھبراہٹ یا وحشت کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ دعا سکھائی ہے:

''بِسمِ اللّٰهِ أَعُوذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ مِنْ غَضَبِهِ ،وَعِقَابِهِ،وَشَرِّ عِبَادِهِ ، وَمِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِينِ وَ أَنْ يَحْضُرُونَ۔''[4]

---

[1] صحیح بخاری،کتاب الوضوء،باب مایقول عند الخلاء،حدیث:142

[2] صحیح بخاری،کتاب بدء الخلق،باب صفة ابلیس وجنوده،حدیث3282۔صحیح مسلم،کتاب البروالصلة والأدب باب فضل من یملک نفسه عند الغضب۔حدیث2610

[3] صحیح بخاری،کتاب الرؤیا،باب فی کون الرؤیا من اللہ۔۔۔۔حدیث:2261

[4] احمد: حدیث16573 ،نسائی، ترمذی، کتاب الدعوات، حدیث:3528

ترجمہ: ''اللہ کے نام کے ساتھ میں پناہ مانگتا ہوں اللہ کے مکمّل کلمات کے ذریعہ اُس کے غصہ و ناراضگی سے اور اُس کی سزا سے اور اُس کے بُرے بندوں (کے شر) سے اور شیطانوں کے وسوسوں (اور گناہوں پر ابھارنے) سے اور اُن (شیطانوں کے) میرے پاس آنے (اور بہکانے) سے''۔

دشمن، صاحبِ سلطنت اور ہر اُس شخص سے ملتے وقت جس سے نقصان پہنچنے کا خدشہ ہو

نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جب بھی کسی قوم سے اندیشہ یا خوف ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس طرح دعا فرماتے:

'' اللَّهُمَّ إِنَّا نَجْعَلُكَ فِي نُحُورِهِمْ وَنَعُوذُ بِكَ مِنْ شُرُورِهِمْ۔''[1]

ترجمہ: ''اے اللہ! ہم تجھے ہی ان کے مقابلہ میں کرتے ہیں اور ان کے شر سے تیری ہی پناہ وحفاظت میں آتے ہیں۔''

سواری خریدنے پر اور شادی کے بعد بیوی سے پہلی ملاقات کے وقت

فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے: جب تم میں سے کوئی شخص شادی کرے یا لونڈی یا سواری خریدے تو اُس کی پیشانی پکڑ کر یہ دعا کرے:

''اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ خَيْرَهَا، وخَيْرَ مَا جَبَلتها عَلَيْهِ ،وأَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّهَا ، وشَرِّ مَا جَبَلْتَهَا عَلَيْهِ''۔[2]

ترجمہ: ''اے اللہ! میں تجھ سے اس کی بھلائی کا اور اُس چیز کی بھلائی کا جس پر تو نے اُسے پیدا کیا سوال کرتا ہوں اور میں تجھ سے اُس کے شر سے اور اُس چیز کے شر سے جس پر تو نے اسے پیدا کیا پناہ طلب کرتا ہوں۔''

---

[1] ابوداؤد و صححه الالبانی،کتاب الصلاة،باب ما یقول الرجل إذا خاف قوماً،حدیث:1537

[2] ابوداؤ ،کتاب النکاح،باب فی جامع النکاح،حدیث:2160۔

نیا لباس پہنتے وقت

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نیا لباس پہنتے وقت یہ دعا فرماتے:

” اللَّهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ ، أَنْتَ كَسَوْتَنِي ، أَسْأَلُكَ مِنْ خَيرِهِ وَخَيْرِ مَا صُنِعَ لَهُ ، وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّهِ وَشَرِّ مَا صُنِعَ لَهُ۔“[1]

ترجمہ ”اے اللہ! تمام تعریفات تیرے ہی لیے ہیں تو نے ہی مجھے یہ پہنایا ہے، میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اس (کپڑے) کی بھلائی کا اور اس کی بھلائی کا جس کے لیے اسے بنایا گیا ہے اور میں تیری پناہ میں آتا ہوں اس (کپڑے) کے شر سے اور اس شر سے جس کے لیے اسے بنایا گیا۔“

حقِ زوجیت (صحبت) ادا کرنے سے پہلے

فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے: جب تم میں سے کوئی اپنی بیوی کے پاس (صحبت و جماع کے لیے) آنے کا ارادہ کرے تو یہ دعا پڑھے:

”بِسْمِ اللّٰهِ، اللَّهُمَّ جَنِّبْنَا الشَّيْطَانَ، وَجَنِّبْ الشَّيْطَانَ مَا رَزَقْتَنَا۔“[2]

ترجمہ:”میں ابتدا کرتا ہوں اللہ کے نام کے ساتھ، اے اللہ! تو ہمیں شیطان سے بچا اور اُس (اولاد) کو (بھی) شیطان سے بچا جو تو ہمیں عطاء فرمائے۔“ (اور فرما:) اگر اللہ نے اس (جماع) میں اُن دونوں کے لیے اولاد مقدّر فرمائی تو شیطان اُس اولاد کو (عقل و جسمانی طور پر) نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔

---

[1] ابوداؤد و صححه الالبانی،کتاب اللباس،باب ما یقول إذا لبس ثوباً جریراً،حدیث:4020

[2] صحیح بخاری ،کتاب الوضوء باب التسمیة علی کل حال ،عند الوقاع،حدیث:414۔صحیح مسلم،کتاب النکاح،باب ما یستحب أن یقوله عندالجماع،حدیث1434

آندھی چلنے کے وقت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہوا کی برائی سے اللہ کی پناہ طلب کرنے کا حکم دیا ہے، لہٰذا آندھی کے موقع پر یہ دعا پڑھنا مسنون ہے:

" اللَّهُمَّ إِني أَسْأَلُكَ خَيْرَهَا ، وَخَيرِ مَا فِيهَا ، وخَيْر ما أُرسِلَتْ بِهِ ، وَأَعُوذُ بك مِنْ شَرِّهِا ، وَشَرِّ ما فِيها ، وَشَرِّ ما أُرسِلَت بِهِ۔" [1]

ترجمہ: ''اے اللہ میں تجھ سے اس (ہوا) کی خیر و بھلائی کا سوال کرتا ہوں اور اس خیر کا (بھی) جو اس میں ہے اور جس کے ساتھ اسے بھیجا گیا ہے۔ اور میں اس (ہوا) کے شر و نقصان سے تیری پناہ و حفاظت میں آتا ہوں اور اس شر سے (بھی) جو اس مین ہے اور جس کے ساتھ اسے بھیجا گیا ہے''۔

گدھوں کے ہینکنے اور کتوں کے بھونکنے کے وقت:

فرمانِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے: ''گدھے کی ہینک سنو تو شیطان (کے شر) سے اللہ کی پناہ مانگو (یعنی: اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ پڑھو) کیونکہ وہ شیطان کو دیکھتا ہے۔'' [2]

اور فرمایا: ''کتوں کے بھونکنے کی آواز سنو تو اُن سے اللہ کی پناہ مانگو (یعنی: اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ پڑھو) کیونکہ وہ وہ دیکھتے ہیں جو تم نہیں دیکھ پاتے۔'' [3]

تعوّذ پڑھنے کے فوائد

❁ تعوّذ پڑھ کر اللہ تعالیٰ کی نہ ختم ہونے والی طاقت و قدرتِ کاملہ کا اعتراف کرتے ہوئے اُسی سے مدد مانگی جاتی ہے اور اُس ایک اللہ کی وحدانیت کا اقرار و اعتراف کیا جاتا ہے۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ وَكَفَىٰ بِرَبِّكَ وَكِيلًا﴾۔ (الاسراء:65)

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الصلاة الاستسقاء، باب التعوذ عندرؤیةعن الریح۔۔ حدیث:899

[2] ابوداؤد، کتاب السنة، باب ،ماجاء فی الدیک والبهائم۔۔حدیث:5102

[3] مسند احمد:23/130(14830)

’’میرے خاص بندوں پر تو (شیطان) ذرا بھی قابو نہ پاسکے گا اور آپ (ﷺ) کے رب کا کارساز ہونا ہی کافی ہے۔‘‘

❁ تعوّذ کے ذریعہ انسانی کمزوری و بے بسی کا اقرار کیا جاتا ہے کہ وہ خود اپنی حفاظت تک پر قادر نہیں بلکہ ہر لمحہ انسان اللہ تعالیٰ کا محتاج ہے۔فرمانِ الٰہی ہے:﴿يَاأَيُّهَا النَّاسُ أَنتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللَّهِ وَاللَّهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ﴾۔(الفاطر:15)

ترجمہ:’’انسانو!تم سب کے سب اللہ کے محتاج ہو اور اللہ سب سے بے نیاز اور قابلِ حمد وثنا ہے۔‘‘

❁ تعوّذ کے ذریعہ شیطان جیسے بدترین دشمن جو انسان کو دیکھتا ہے مگر انسان اس خنّاس کو نہیں دیکھ سکتا سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کی جاتی ہے۔

❁ تعوّذ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے یہ درخواست کی جاتی ہے کہ وہ ہر برائی کرنے والے کی برائی سے اُسے محفوظ رکھے۔رسول اکرم ﷺ نے سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ سے فرمایا:’’اے ابوذر، اللہ کی مدد کے ذریعہ جناتی اور انسانی شیاطین سے اللہ کی پناہ میں رہو‘‘۔ابوذر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: کیا انسانوں میں بھی شیطان ہوتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا:’’جی ہاں‘‘۔[1]

❁ لہٰذا تعوّذ کے ذریعہ جن امور میں انسان کو اللہ کی پناہ وحفاظت میسر ہوجائے تو پھر دنیا کی کوئی مخلوق اور چیز اُسے نقصان نہیں پہنچاسکتی۔

❁ انسان کی زبان سے غیر ضروری باتیں نکل جاتی ہیں جس سے منہ روحانی طور پر آلودہ ہوجاتا ہے۔ تعوّذ کے ذریعہ یہ آلودگی دور ہوکر زبان تلاوت ونیک باتیں کرنے کے قابل ہوجاتی ہے۔

لہذا ہمیں ان مواقع پر بالخصوص اوران کے علاوہ عمومی طور پر تعوذ کا اہتمام کرتے رہنا چاہیے تاکہ ہم خود کو اللہ کی حفاظت میں دیتے ہوئے جن وانس کے شر سے محفوظ رکھ سکیں۔

وآخرُ دعوانا أنِ الحمدُ للہ ربِّ العالمَین

---

[1] مسند احمد:35/437(21522)

ایک مجلس کی تین طلاقیں

اور بھارتی سپریم کورٹ کا فیصلہ

فقہی جمود نے غیروں کو جگ ہنسائی کا موقع دے دیا! إنّا للہ و إنّا إلیہ راجعون

حافظ صلاح الدین یوسف [1]

ایک مجلس کی تین طلاقوں کا مسئلہ اگرچہ صدیوں سے مختلف فیہ چلا آرہا ہے لیکن جب تک اسلامی یا مسلمان معاشروں میں شریعت پر عمل کا جذبہ توانا، مرد اور عورت کے باہمی حقوق کی پاسداری کا خیال فراواں اور ہمدردی وتعاون کا سکہ رواں رہا، اس مسئلے نے زیادہ گھمبیر شکل اختیار نہیں کی تھی، اس لئے اس کی کٹھنائیاں بھی زیادہ سامنے نہیں آئیں۔ لیکن اب صورتِ حال سالہا سال سے کافی مختلف ہے۔ اب مسلمانوں کی اکثریت جہاں ایک طرف اسلامی تعلیمات سے نابلد ہے تو دوسری طرف صبر وتحمل سے بھی عاری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پہلے طلاق کی شرح برائے نام تھی تو اب اس کی شرح آسمانوں سے باتیں کرتی نظر آتی ہے۔ پھر ستم بالائے ستم یہ فقہی جمود کہ عام لوگوں کی جہالت کی وجہ سے تو ہزاروں گھر اُجڑ گئے اور اُجڑ رہے ہیں اور پتہ نہیں کب تک اُجڑتے رہیں گے لیکن عوامی اکثریت کے حامل حنفی علما اس صورتحال پر سنجیدہ غور وفکر کرنے سے گریزاں ہیں۔ اُجڑتے گھرانے اور بڑھتے مسائل آئے روز ان کی نظروں کے سامنے آتے ہیں لیکن وہ کوئی شرعی گنجائش دینے کو آمادہ نہیں۔ جس چیز کا حل شریعتِ اسلامیہ میں موجود ہے حتی کہ

[1] مشیر وفاقی شرعی عدالت، نگران شعبہ تحقیق وتصنیف المدینہ اسلامک ریسرچ سنٹر کراچی

فقہ حنفی میں بھی اس کے بعض شرعی متبادل پائے جاتے ہیں لیکن ایسے متوازن حل کی طرف پیش قدمی کی بجائے حلالہ کا ناجائز اور بے غیرتی بر مبنی راستہ دکھادیا جاتا ہے۔اس طرح حنفی علما نے اپنے معتقدین کے لئے آسانی کی بجائے ایک مشکل ترین راستے کو منتخب کر رکھا ہے۔ جو عورت ایک بار اِن مسائل کا شکار ہوجائے تو بے شک اس کا گھر اُجڑ جائے، اس کے بچے رُل جائیں، خود وہ عورت بے آسرا اور بے سہارا ہو کر در بدر کی ٹھوکریں کھائے لیکن ان تقدس مآبوں کے دل نہیں پسیجتے، ان کے دکھوں اور دردوں کا کوئی درماں ان کے پاس نہیں ہے، اُن کے رِستے زخموں کے لئے ان کے پاس کوئی پھاہا نہیں ہوتا۔

❁ کیا یہ اسلامی یا مسلمان معاشرے کی اچھی تصویر ہے...؟

❁ یا خدانخواستہ اسلام کا نظامِ طلاق ایسا بے رحمانہ اور ظالمانہ ہے...؟

❁ کیا اسلام میں مذکورہ مظلوم عورتوں اور بچوں کا کوئی حل نہیں ہے...؟

❁ کیا ایک مسلمان کی جہالت کا ازالہ ''بے غیرتی'' (حلالہ) اختیار کئے بغیر نہیں ہوسکتا؟

❁ ہمارے یہ چار سوال ان علماء سے ہیں جو فقہی جمود میں اس طرح مگن ہیں کہ ان مسائل کے حل کی طرف ان کی توجہ ہی نہیں جاتی۔

ہم عرض کریں گے کہ اسلام وہ پہلا مذہب ہے جس نے سب سے پہلے عورتوں پر ہونے والے مظالم کا خاتمہ کیا تھا، ان کو عزت واحترام کا اعلیٰ مقام عطا کیا تھا، وہ اس ظلم وستم کا روادار کب ہوسکتا ہے جو مسئلۂ طلاقِ ثلاثہ کے نام پر مذہبی قیادت کی طرف سے عورتوں پر رَوا رکھا جا رہا ہے۔ان حضرات کے اس رویے سے اسلام پر ایسے بدنما اعتراضات اُٹھ جاتے ہیں جن کی وضاحت ممکن نہیں رہتی۔ اسلام کے نظامِ طلاق میں قطعاً ایسی کوئی بات نہیں جس سے مسلمان عورت پر ظلم کا دروازہ کھلے۔البتہ اس میں دو عنصر ایسے ہیں جو اسلام کی بدنامی کا باعث ہیں:

ایک، اسلام نے مرد کو جو طلاق کا حق دیا ہے، جو بڑی حکمتوں پر مبنی ہے، مسلمان مرد اپنے اس حق طلاق کو غلط طریقے سے استعمال کرتے ہیں۔

دوسرے، وہ علماء ہیں جو طلاق کے غلط طریق استعمال سے ہونے والی کوتاہیوں کا ازالہ کرنے کی کوئی فکر نہیں کرتے۔ اگر ان دونوں کا رویّہ صحیح ہو جائے یا کم از کم دونوں میں سے کوئی ایک ہی اپنا رویہ ٹھیک کر لے تو یہ مسئلہ نہایت آسانی سے حل ہو جاتا ہے۔

1 پہلی بات تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مرد کو طلاق کا حق اس لئے نہیں دیا کہ وہ اس کو غلط طریقے سے استعمال کر کے عورت پر ظلم کرے اور ذرا ذرا سی بات پر طلاق دے ڈالے۔[1] بلکہ گھر کا نظام مستحکم طریقے سے چلانے کے لئے مرد کو حاکمیت کا جو مقام عطا کیا گیا ہے، حق طلاق بھی اس کا ایک حصہ ہے۔

2 بد قسمتی سے مسلمان عوام میں اسلامی تعلیمات کا یہ شعور بالعموم نہیں ہے لیکن علما کو تو باشعور ہونا چاہئے تا کہ وہ عوام کی جہالت کا ازالہ ''خرابیٔ بسیار'' سے پہلے ہی کر لیں اور ایسا کرنا کوئی مشکل بات بھی نہیں ہے۔ صرف فقہی جمود کے بجائے فقہی توسع کی اور شریعت کی عطا کردہ سہولتوں سے عوام کو بہرہ ور کرنے کی ضرورت ہے۔

عوام تو کالأنعام ہوتے ہیں، ان کو سمجھانا مشکل ہے، نیز ان کی تعداد بھی علماء کے مقابلے میں بے انتہا ہے، ان سب تک رسائی ناممکن ہے۔ اگر علما اس کو سمجھ لیں اور ان کے دل عوام کی خیر خواہی کے جذبوں سے معمور ہوں تو یہ مسئلہ آسانی سے حل ہو سکتا ہے۔

ہم پورے شرحِ صدر اور نہایت یقین واذعان سے یہ بات کہتے ہیں کہ ہم مسئلے کا جو حل پیش کریں گے، اس میں دائرۂ شریعت سے قطعاً تجاوز نہیں ہوگا بلکہ فقہی جکڑ بندیوں سے بھی باہر نکلنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی، کیونکہ بہت سے حنفی علما انہی فقہی پابندیوں میں ہی جینا چاہتے ہیں۔

موجودہ حالات میں ایک مجلس کی تین طلاقوں کا صحیح حل

مسلمان عوام کی جہالت، بے صبری و عدم تحمل اور طریقۂ طلاق سے بے شعوری کی وجہ سے مسلمان عورتوں اور بچوں پر جو ظلم ہو رہا ہے، اس کے ازالے کا ایک ہی طریقہ اور اس مرض کا ایک ہی علاج ہے کہ

[1] اس کی تفصیل راقم کی کتاب 'ایک مجلس کی تین طلاقیں اور اس کا شرعی حل' ناشر: دارالسلام، لاہور میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

بیک وقت دی گئیں تین طلاقوں کو ایک طلاقِ رجعی قرار دیا اور تسلیم کرلیا جائے تاکہ عدت کے اندر رجوع اور عدت گزرنے کی صورت میں نئے نکاح کے ذریعے سے ٹوٹا ہوا تعلق بحال ہوجائے۔ یوں بے شمار گھر اُجڑنے سے اور بچے بے سہارا ہونے سے بچ جائیں گے۔

یہ حل قرآن وحدیث کی تعلیمات کے مطابق ثابت شدہ بھی ہے اور اس کے اختیار کرنے سے مذہبِ حنفی سے خروج بھی لازم نہیں آتا۔ اس کی مکمل تفصیل اور دلائل راقم کی کتاب 'ایک مجلس میں تین طلاقیں' نامی کتاب میں موجود ہیں، یہاں صفحات کی تنگ دامانی اس کے بیان کرنے سے مانع ہے۔

یہ دلائل الحمدللہ اتنے قوی ہیں اور موجودہ حالات کے تناظر میں ان کی صحت بھی اتنی یقینی ہے کہ برصغیر پاک وہند کے متعدد حنفی علمانے بھی ان سے اتفاق کرتے ہوئے اپنے فتووں، مقالات اور سیمیناروں میں اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ مجلس واحد کی تین طلاقوں کو ایک طلاق شمار کرکے رجوع اور صلح کا حق دینا شرعاً بالکل صحیح ہے اور یہ دیا جانا چاہیے۔

ایک مجلس کی تین طلاقوں کو ایک طلاق تسلیم کرنے والے بھارتی حنفی علما کے اسمائے گرامی

بھارت کے جن حنفی علمانے اس موضوع پر اپنے نتائج مطالعہ وتحقیق پیش کیے ہیں، اور ایک مجلس کی تین طلاقوں کو ایک طلاق شمار کرنے پر زور دیا ہے، ان میں سے چند نمایاں نام حسب ذیل ہیں:

1. مولانا ابوالکلام آزاد
2. مولانا سعید احمد اکبرآبادی — مدیر ماہنامہ 'برہان' دہلی
3. مولانا عروج احمد قادری — مدیر ماہنامہ 'زندگی' رامپور
4. مولانا مفتی عتیق الرحمٰن — صدر آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت
5. مولانا حامد علی — سیکرٹری جماعتِ اسلامی، ہند
6. مولانا شمس پیرزادہ — ممبئی

7	مولانا محفوظ الرحمٰن قاسمی	فاضل دیوبند
8	مولانا وحید الدین خان	
9	مولانا سلطان احمد اصلاحی	
10	مولانا سید سلمان الحسینی الندوی	
11	مولانا الطاف احمد اعظمی	
12	مولانا عنایت اللہ اسد سبحانی	ڈائریکٹر کلیۃ القرآن، کیرالہ
13	مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی	مالیر کوٹلہ (ماہنامہ'الشریعہ' گوجرانوالہ)
14	مولانا ابوالحسنات ندوی	رفیق دارالمصنفین، اعظم گڑھ وغیرہم

بعض علماوہ ہیں جنہوں نے اہلحدیث علما سے فتوے حاصل کر کے رجوع کرنے کا جواز تسلیم کیا ہے۔ان میں

15. مولانا عبدالحئ لکھنوی رحمہ اللہ
16. مفتیٔ اعظم ہند مولانا مفتی کفایت اللہ مرحوم جیسے کبار علما شامل ہیں۔

پاکستانی علمائے احناف اور اہل فکر و دانش

17	پیر کرم شاہ الازہری	بھیرہ
18	مولانا عبدالحلیم قاسمی	جامعہ حنفیہ قاسمیہ گلبرگ، لاہور
19	حافظ حسین احمد قاسمی	جامعہ حنفیہ گلبرگ، لاہور
20	مولانا حسین علی	واں بھچراں
21	مولانا یٰسین شاہ	فاضل دیوبند، جھنگ
22	مولانا احمد الرحمٰن	خطیب جامع مسجد، پاک سیکرٹریٹ، اسلام آباد
23	پروفیسر ڈاکٹر محمد اکرم ورک	گورنمنٹ کالج قلعہ دیدار سنگھ گوجرانوالہ
24	ڈاکٹر رضوان علی ندوی	کراچی

25 ڈاکٹر مفتی غلام سرور قادری — دار العلوم رضویہ، ماڈل ٹاؤن لاہور

26 مولانا مفتی محمد زاہد — شیخ الحدیث جامعہ امدادیہ فیصل آباد (ان کا فتویٰ نشے کی حالت میں عدم طلاق کا ہے جس کے اکثر احناف قائل نہیں۔)

27 مولانا مفتی محمد شفیع مرحوم — دار العلوم کراچی

28 جناب عمار خان ناصر — مدیر ماہنامہ 'الشریعہ' گوجرانوالہ وغیرہم

29 ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی — ہائی ٹیک یونیورسٹی، ٹیکسلا

برصغیر پاک وہند کے مذکورہ تمام علمائے احناف کے فتاویٰ، مقالات اور آرا راقم کی کتاب 'ایک مجلس کی تین طلاقیں اور اس کا شرعی حل، مشاہیر اُمت اور پاک وہند کے متعدد علمائے حنفیہ کی نظر میں' موجود ہیں۔ یہ کتاب دار السلام لاہور سے 2007ء میں شائع ہوئی جو مارکیٹ میں موجود ہے۔

ان سب کے اقتباسات تو اس مضمون میں نہیں دیئے جاسکتے، چند آرا ذکر کی جاتی ہیں، باقی آرا کتاب میں دیکھی جاسکتی ہیں:

1 ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی (فیکلٹی آف اسلامک سٹڈیز، ہائی ٹیک یونیورسٹی، ٹیکسلا) اسی بھارتی سپریم کورٹ کے زیر بحث مسئلے سے متعلق فیصلے پر گفتگو کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں، یاد رہے کہ موصوف پختہ حنفی ہیں:

''اس سماجی تفاوت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے سماج میں طلاق کی صورت میں سزا مرد کو نہیں، بیوی کو ملتی ہے۔ مزید یہ کہ جہالت، دین سے بے بہرہ ہونے اور اُجڈ پن کی وجہ سے طلاق چونکہ اچانک اور یکبارگی تین دے دی جاتی ہیں، جو ایک خاندان، دو گھرانوں اور بچوں کے لئے تباہ کن ہوتی ہے۔ ایسے میں یکبارگی تین طلاق کو نافذ کرنا مجرم کو سزا دینا نہیں بلکہ مظلوم پر مزید ظلم کرنے کے مترادف ہے۔ لہٰذا ہماری رائے یہ ہے کہ حالات وزمانے کی تبدیلی کی رعایت کا تقاضا یہ ہے کہ ہمارے سماج میں یکبارگی دی جانے والی تین طلاقوں کو ایک قرار دیا جائے۔ جیسا کہ عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور عہدِ صدیقی رضی اللہ عنہ اور عہد فاروقی رضی اللہ عنہ کے ابتدائی دو سالوں میں یہی قانون تھا۔ نیز کئی ایک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم،

تابعین رحمہم اللہ اور ائمہ کرام کی بھی یہی رائے ہے۔ نیز اگر حکومت مختلف فقہی آرا میں کسی ایک رائے کو قانون کا درجہ دے دے تو وہ رائے مرجوح ہو، تب بھی فتویٰ اور فیصلے اسی کے مطابق کئے جائیں گے۔'' [1]

2 مولانا سلطان احمد اصلاحی، ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی، علی گڑھ کے نہایت اہم رکن ہیں۔ مسلکاً حنفی ہیں، لیکن اللہ نے فقہی جمود سے ہٹ کر سوچنے کی توفیق سے نوازا ہے۔ طلاقِ ثلاثہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''سرفہرست مسئلہ طلاقِ ثلاثہ کا ہے۔ ہندوستان کے موجودہ حالات میں مصلحت اس کی متقاضی ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاق کو ایک ہی تسلیم کیا جائے۔ ضرورت کے تقاضے سے اگر مفقود الخبر کے مسئلے میں مالکیہ کے مسلک پر شرحِ صدر سے عمل کیا جارہا ہے تو اس طرح کی ضرورت سے اگر اس مسئلے میں بھی مسلکِ اہل حدیث کو اختیار کرلیا جائے تو یہ کوئی گناہ اور کسی جرم کا ارتکاب نہیں ہوگا۔ حلالے کا حیلۂ شرعی آج کے تنقیدی اور سوالیاتی دور میں اس دین کی بدنامی کا باعث ہے۔ اس برائی کے ارتکاب سے بہت بہتر ہے کہ اُمت کے ایک معتبر فقہی دھارے کی رخصت اور رعایت سے فائدہ اُٹھا لیا جائے۔ مزید تفصیل کے لئے دیکھے جائیں خاکسار کے دو مضامین: ''مسئلہ طلاق، متوازن نقطۂ نظر'' اور ''مسئلہ طلاق، بعض ملاحظات'' مطبوعہ سہ روزہ ''دعوت'' دہلی۔ نیز پندرہ روزہ ''ترجمان'' اہل حدیث دہلی۔ اس کے سلسلے میں علمائے ملت سے اسی قدر گزارش کی جاسکتی ہے کہ وہ اسے مسلکی اَنا کا مسئلہ بنانے کی بجائے اسلام، اُمت اور دعوت کے پس منظر میں دیکھیں اور اللہ کے دین کو بدنام ہونے سے بچائیں۔'' [2]

3 ایسے ہی ماہنامہ ''الشریعہ'' کے مدیر جناب عمار خاں ناصر اپنے ایک مضمون بعنوان ''معاشرہ، قانون اور اخلاقیات، نفاذِ شریعت کی حکمتِ عملی کے چند اہم پہلو'' میں تحریر کرتے ہیں:

---

[1] ماہنامہ 'الشریعہ' گوجرانوالہ، اکتوبر 2017ء: ص 34

[2] مجموعۂ مقالات، سیمینار 'علوم الحدیث، مطالعہ وتعارف': ص 226، 231

''ایک ایسا معاشرہ جہاں لوگوں کی اکثریت طلاق کے شرعی طریقے اور اس کی حکمتوں سے ناواقف ہو، جہاں معاشرتی، معاشی مشکلات و مسائل نے لوگوں سے صبر و حوصلہ اور تحمل چھین کر اُنہیں ذہنی تناؤ کا مریض بنا دیا ہو، جہاں مطلقہ عورت کے لئے باعزت زندگی گزارنا یا عقدِ ثانی کرنا بے حد مشکل ہو اور طلاق مرد کی بجائے حقیقت میں عورت کے لئے سزا قرار پائے، کیا ایسے معاشرے میں ایک مجلس کی تین طلاقوں کو لازماً نافذ قرار دینا حکمت و مصلحت پر مبنی شریعت کا منشا ہوگا اور کیا اس سے اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود کو پامال کرنے کی سزا فی الواقع اس کے اصل مجرم یعنی شوہر ہی کو ملے گی۔''[1]

موصوف کے اس اقتباس سے واضح ہے کہ وہ اپنے ہم مسلک علمائے احناف بلکہ اپنے دادا مرحوم کے موقف کو کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں تین ہی واقع ہو جاتی ہیں، شریعت کی حکمت و مصلحت کے خلاف سمجھتے ہیں۔

مسئلہ زیر بحث، مذاہبِ اربعہ کی روشنی میں

برصغیر پاک و ہند کے جن علمائے احناف نے طلاقِ ثلاثہ کے ایک طلاق رجعی ہونے کا موقف اختیار کیا ہے، وہ قرآن وحدیث کی تصریحات کے تو مطابق ہے ہی لیکن اس میں ائمہ اربعہ کے مسلک سے بھی انحراف نہیں پایا جاتا جن کی بابت یہ دہائی دی جاتی ہے کہ ان کے متفقہ مسلک سے انحراف کی قطعاً اجازت نہیں ہے۔ لیجئے! ائمہ اربعہ اور مذاہب اربعہ کا موقف بھی ذیل میں ملاحظہ فرمالیں:

مذاہب اربعہ کا متفقہ موقف... تاکید کے طور پر ''تین طلاقیں، ایک ہی طلاق ہے!''

چاروں فقہوں (حنفی، حنبلی، شافعی اور مالکی) میں ایک اور نقطہ نظر سے بھی تین دفعہ طلاق کا لفظ دہرانے کے باوجود اسے ایک طلاق شمار کرنے کی گنجائش موجود ہے، حالانکہ یہ سب اصحابِ فقہ ایک وقت کی تین طلاقوں کو تین ہی شمار کرنے کے قائل ہیں۔

[1] ماہنامہ 'الشریعۃ' گوجرانوالہ، دسمبر 2010ء: ص48، 49

چنانچہ کتاب الفقه على المذاهب الأربعة کے مؤلف فقہ مالکی کی صراحت کرتے ہیں:

فقہ مالکی کا فتوی

الصورة الأولىٰ: أن يقول لها: ''أنتِ طالق طالق طالق بدون عطف وتعليق وحكم هذه الصورة أنه يقع بها واحدة إذا نوى بالثانية والثالثة التأكيد۔'' [1]

''اگر اس نے کہا: تجھے طلاق طلاق طلاق بغیر عطف اور تعلیق کے تو اس صورت میں ایک ہی طلاق ہوگی جب اس کی نیت دوسری، تیسری طلاق سے تاکید کی ہو۔''

فقہ حنبلی کا فتوی

حنبلی مسلک کی کتاب 'المغنی' میں علامہ ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں:

فإن قال: '' أنت طالق طالق، طالق وقال أردت التوكيد قبل منه لأن الكلام يكرّر للتوكيد كقوله عليه السلام: ''فنكاحها باطل باطل باطل''.وإن قُصد الايقاع وكرّر الطلقات طُلّقت ثلاثا. وإن لم ينو شيئًا لم يقع إلا واحدة۔'' [2]

''اگر کہا: تجھے طلاق ہے طلاق ہے طلاق ہے اور کہے کہ میں نے تاکید کی غرض سے کہا تھا تو اس کا یہ بیان قبول کرلیا جائے گا کیونکہ بات تاکیداً دہرائی جاتی ہے جس طرح کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:''اس کا نکاح باطل ہے باطل ہے باطل ہے'' (یعنی ایک حدیث میں نکاح کے باطل ہونے کا لفظ تاکید کی غرض سے تین مرتبہ دہرایا گیا ہے) لیکن اگر اس کی نیت تین طلاقوں کے ایقاع (واقع کرنے) کی تھی اور طلاقوں کو دہرایا تھا تو پھر تین طلاقیں واقع ہوں گی اور اگر کوئی نیت نہیں تھی تو صرف ایک طلاق ہوگی۔''

---

[1] الفقه على المذاهب الأربعة: كتاب الطلاق، مبحث تعدد الطّلاق:4/310

[2] المغنی از ابن قدامہ7/232،369دارالفکر، بیروت1984ء

فقہ شافعی کا فتویٰ

شافعی مسلک کی کتاب روضۃ الطالبین میں امام نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

”ولو كرّر اللفظة ثلاثًا وأراد بالآخرتين تأكيد الأولىٰ لم يقع إلا واحدة۔“[1]

”اگر اس نے طلاق کا لفظ تین مرتبہ دہرایا لیکن آخری دو مرتبہ سے اس کا مقصد پہلی طلاق کی تاکید تھا تو ایک ہی طلاق واقع ہوگی۔“

فقہ ظاہری کا فتوی

علامہ ابن حزم المحلّٰی میں لکھتے ہیں:

فلو قال لموطوئة: ”أنت طالق أنت طالق أنت طالق، فإن نوى التكرير لكلمته الأولى وإعلامها فهى واحدة وكذلك إن لم ينو بتكراره شيئًا۔“[2]

”مدخول بہا عورت سے شوہر نے کہا: تجھے طلاق، تجھے طلاق، تجھے طلاق۔ پس اگر اس تکرار سے اس کی نیت پہلی طلاق ہی کی تاکید اور اس کی اطلاع ہے تو یہ ایک ہی طلاق ہے اور اسی طرح اس وقت بھی ایک ہی طلاق ہوگی جب اس تکرار سے اس کی کوئی نیت ہی نہ ہو۔“

فقہ حنفی کا فتویٰ

1 حنفی مسلک کی کتاب 'بہشتی زیور' میں مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم لکھتے ہیں:

”کسی نے تین دفعہ کہا: تجھ کو طلاق، طلاق، طلاق، تینوں طلاقیں پڑ گئیں یا گول الفاظ میں تین مرتبہ کہا، تب بھی تین پڑ گئیں۔ لیکن اگر نیت ایک ہی طلاق کی ہے، فقط مضبوطی کے لئے تین دفعہ کہا کہ بات خوب پکی ہو جائے تو ایک ہی طلاق ہوئی لیکن عورت کو اس کے دل کا حال تو معلوم نہیں، اس لئے

---

[1] روضۃ الطالبین، 8/78، طبع المکتب الاسلامی، بیروت 1991ء

[2] المحلی: 10/174

یہی سمجھے کہ تین طلاقیں مل گئیں۔''[1]

2 مولانا مجیب اللہ ندوی (بھارت): آپ بھی مسئلۂ طلاقِ ثلاثہ میں حنفی موقف کے نہایت سختی سے قائل ہیں لیکن اس کے باوجود اپنی کتاب 'اسلامی فقہ' میں لکھتے ہیں:

''البتہ اگر کسی نے اس طرح کہا کہ تجھ کو طلاق، طلاق، طلاق تو اگر اس سے اس کی نیت تین طلاق دینے کی نہیں تھی بلکہ صرف تاکید کرنی مقصود تھی تو ایک ہی طلاق رجعی پڑے گی۔''[2]

3 مفتی مہدی حسن (سابق صدر مفتی دار العلوم دیوبند): اپنی کتاب إقامة القيامة میں تحریر کرتے ہیں:

''اگر عورت مدخول بہا ہے اور ایک ہی طلاق دینے کا ارادہ تھا لیکن بتکرار لفظ تین طلاق دی اور دوسری اور تیسری طلاق کو بطورِ تاکید استعمال کیا ہو تو دیانتاً قسم کے ساتھ اس کا قول معتبر ہوگا اور ایک طلاقِ رجعی واقع ہوگی، اس میں اختلاف نہیں۔''[3]

4 مولانا خالد سیف اللہ رحمانی (سیکرٹری جنرل مسلم پرسنل لا بورڈ، ہند): تاکید کے طور پر تین مرتبہ طلاق کا لفظ دہرانے کے بارے میں آپ نے ''تین طلاقوں میں تاکید کا اعتبار'' کا عنوان قائم کر کے اس پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور آپ بھی ان علمائے احناف میں سے ہیں جو ایک مجلس کی تین طلاقوں کے تین ہی واقع ہونے کے مسئلے میں سخت متشدد ہیں، لیکن اس کے باوجود لکھتے ہیں:

''ایک مجلس کی تین طلاقیں بھی واقع ہو جائیں گی، لیکن یہ حکم اس صورت میں ہے جب تین کے عدد کی صراحت ہو مثلاً کہا جائے: ''میں نے تین طلاقیں دیں۔'' اگر صرف طلاق کو تین بار کہا کہ تم کو طلاق، طلاق، طلاق تو اب دو باتوں کا احتمال ہے: ایک یہ کہ تین طلاقیں دینا مقصود ہیں یا یہ کہ ایک ہی طلاق دینی مقصود ہے اور تاکید کے لئے تین بار طلاق کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ پہلی صورت میں تین طلاقیں واقع ہوں گی اور

---

[1] بہشتی زیور: 4/19

[2] اسلامی فقہ: 4/260

[3] إقامة القيامة: ص 75

دوسری صورت میں صرف ایک، اس لئے کہ تاکید کسی چیز کے وقوع کو اور (مزید) مؤکد تو کرتا ہے لیکن اس کی تعداد میں کوئی اضافہ نہیں کرتا۔

اس طرح اس معاملے کا دارومدار طلاق دینے والے کے ارادے پر ہے مگر اس میں اس بات کا قوی احتمال تھا کہ لوگ تین طلاق کے ارادے سے اس طرح کا فقرہ استعمال کریں اور بعد میں بیوی کی علیحدگی سے بچنے کے لئے کہہ دیں کہ تاکید کی نیت تھی، اس لئے فقہانے کہا کہ ایسے فقروں میں دیانتاً اور فی مابینہ وبین اللہ تو ایک ہی طلاق واقع ہوگی۔ یہاں تک کہ اگر کوئی اس طرح طلاق دینے کے بعد پھر اپنی بیوی سے رجعت کرلے تو اس کو ان شاء اللہ کوئی گناہ نہ ہوگا۔

مگر ہمارے زمانے میں جہالت اور ناواقفیت اور شرعی تعلیمات سے دوری کے باعث صورتِ حال یہ ہوگئی ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ طلاق واقع ہی اس وقت ہوتی ہے جب تین بار طلاق کا لفظ کہا جائے۔ ان حالات میں مناسب ہوگا کہ جہاں صرف لفظ 'طلاق' کا تکرار ہو اور تاکید کا معنی مراد لیا جاسکتا ہو، وہاں ایک ہی طلاق واقع قرار دی جائے اور قضاءً (عدالت میں) بھی اس شخص کی نیت کا اعتبار کیا جائے۔ خوشی کی بات ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے دارالافتاء نے اس مسئلے میں پیش قدمی کی ہے اور فتاویٰ میں اس کی رعایت شروع کردی ہے، چنانچہ اس مسئلے پر دارالعلوم دیوبند کا ایک فتویٰ ملاحظہ ہو:

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں کہ زید نے اپنی بیوی کو اس طرح طلاق دی: ''تم کو طلاق طلاق طلاق۔'' اس صورت میں کون سی طلاق واقع ہوگی اور کیا مراجعت کی گنجائش ہوگی؟

(المستفتی: خالد سیف اللہ رحمانی)

جواب: صورتِ مذکورہ میں ہمارے اطراف کے عرف کے اعتبار سے زید کی مدخولہ بیوی پر ایک طلاقِ رجعی واقع ہوئی۔ اگر آپ کے یہاں کا عرف بھی یہی ہو تو ایک طلاقِ رجعی کے وقوع کا حکم ہوگا۔ طلاقِ رجعی کا حکم ہے کہ اندرونِ عدت رجوع اور بعد عدت بغیر حلالہ کے دوبارہ نکاح جائز ہے۔ واللہ اعلم

(الفتاوی الہندیۃ:2/50)

کفیل الرحمٰن نشاط (نائب مفتی دار العلوم دیوبند) 21/شعبان 1405ھ

الجواب الصحیح ظفیر الدین غفرلہ (مفتی دار العلوم دیوبند) 21/شعبان 1405ھ

مہر دار الافتا، دار العلوم دیوبند

ضرورت اس بات کی ہے کہ ملک کے دوسرے دار الافتا اور اہل علم بھی اسی کے مطابق فتویٰ دیا کریں، اس لئے کہ قریب قریب پورے ملک کا عرف یہی ہے کہ لوگوں نے ناواقفیت کی وجہ سے یہ سمجھ رکھا ہے کہ جب تک تین بار طلاق کا لفظ نہ استعمال کیا جائے، طلاق واقع ہی نہ ہوگی۔''

از مرتب: اسی سے ملتی جلتی صورت ہمارے خیال میں یہ ہے کہ لوگ شرعی احکام سے عدم واقفیت کی وجہ سے تین کے عدد کے ساتھ طلاق دیتے ہیں لیکن بعد میں جب اس کا علم ہوتا ہے تو کہتا ہے کہ میں سمجھ رہا تھا کہ تین مرتبہ طلاق کے الفاظ استعمال کئے بغیر طلاق واقع ہی نہیں ہوتی۔[1]

تبصرہ از راقم: اس صورتِ حال کو بھی ہمدردی سے دیکھنا چاہئے اور ایسے شخص کی بھی تین طلاقوں کو تاکید پر محمول کر کے ایک طلاق کے وقوع کا حکم لگانا چاہئے۔

مسلم ممالک میں طلاق کا قانون

مسلم ممالک نے تطلیقاتِ ثلاثہ کے سلسلے میں جو قوانین بنائے ہیں، ان کی حیثیت شرعی حجت کی نہیں ہے، اس لئے ان قوانین کو دلیل کے طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا، تاہم یہ معلوم کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ کن ممالک نے اس سلسلے میں اقدامات کئے ہیں۔ اسی مقصد کے پیشِ نظر، یعنی بغرضِ معلومات اس کی تفصیل پیش کی جاتی ہے:

1 سب سے پہلے مصر نے 1929ء میں ایک ہی وقت کی تین طلاقوں کے اُصول کو ختم کر دیا اور قانون

[1] جدید فقہی مسائل: 2/108 تا 111

یہ بنایا کہ متعدد طلاقیں صرف ایک شمار ہوں گی اور وہ رجعی ہوگی۔ پیر کرم شاہ ازہری نے بھی اپنی مذکورہ کتاب میں اس مصری قانون کی مختصر تفصیل پیش کی ہے اور اس کے حوالے سے پاکستان کے حنفی علما کو بھی یہی مسلک اپنانے کی تلقین کی ہے۔ اس قسم کا قانون سوڈان نے 1935ء میں، اُردن نے 1951ء میں، شام نے 1953ء میں، مراکش نے 1958ء میں، عراق نے 1909 میں اور پاکستان نے 1961ء میں نافذ کیا۔[1]

علمائے حنفیہ کے لئے دعوتِ غور و فکر

اور اب سب سے آخر میں مولانا اشرف علی تھانوی کا طرزِ عمل ملاحظہ فرمائیں۔ ضرورت کے تحت فقہ حنفی کو چھوڑنے کے لئے مولانا اشرف علی تھانوی کا طرزِ عمل ایک مثال ہے:

آج سے تقریباً 88 سال قبل 1351ھ/1932ء میں مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم نے ایک کتاب تالیف فرمائی تھی جس کا نام ہے: ''الحیلة الناجزة للحلیة العاجزة'' (مشکلات سے دوچار شادی شدہ عورت کے لئے کامیاب حیلہ یا تدبیر) اس میں حسبِ ذیل عورتوں کی مشکلات کا حل پیش کیا گیا تھا:

- نامرد شخص کی بیوی
- مجنون شخص کی بیوی
- مُتعنّت (نان نفقہ نہ دینے والے) کی بیوی
- مفقود الخبر (لاپتہ شوہر) کی بیوی

ان کا حل پیش کرنے کی وجہ یہ تھی کہ فقہ حنفی میں مذکورہ عورتوں کی مشکلات کا یعنی خاوندوں سے گلوخلاصی (چھٹکارا) حاصل کرنے کا کوئی طریقہ نہیں ہے، اس بات کا اعتراف اس کتاب کے نئے ایڈیشن کے دیباچے میں مولانا تقی عثمانی صاحب نے بھی کیا ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''ایسی خواتین جنھوں نے نکاح کے وقت تفویض طلاق کے طریقے کو اختیار نہ کیا ہو، اگر بعد میں کسی شدید مجبوری کے تحت شوہر سے گلوخلاصی حاصل کرنا چاہیں، مثلاً شوہر اتنا ظالم ہو کہ نہ نفقہ دیتا ہو، نہ آباد کرتا ہو، یا وہ پاگل ہو جائے یا مفقود الخبر ہو جائے یا نامرد ہو اور از خود طلاق یا خلع پر آمادہ نہ ہو تو

[1] ایک مجلس کی تین طلاقیں... از راقم: ص 69،68

اصل حنفی مسلک میں ایسی عورت کے لئے شدید مشکلات ہیں، خاص طور پر ان مقامات پر جہاں شریعت کے مطابق فیصلے کرنے والا کوئی قاضی موجود نہ ہو، ایسی عورتوں کے لئے اصل حنفی مسلک میں شوہر سے رہائی کی کوئی صورت نہیں ہے۔"[1]

مولانا اشرف علی تھانوی نے مذکورہ بیشتر مسائل میں فقہ حنفی کو ترک کر کے مالکی مذہب کے مطابق فتویٰ دیا اور اس کی روشنی میں ان کو اپنے شوہروں سے گلوخلاصی (چھٹکارے) کا طریقہ بتلایا، اس کی تفصیل مذکورہ کتاب میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے، علاوہ ازیں مولانا تھانوی کے ان فتووں کو اس وقت کے تمام کبار حنفی علما نے بھی تسلیم کیا جن کی تصدیقات بھی اس کتاب میں موجود ہیں۔ کسی نے بھی ان پر فقہ حنفی سے خروج کا فتوی نہیں لگایا کیونکہ کتاب میں مولانا تھانوی نے صراحت کی ہے کہ ضرورتِ شدیدہ کے وقت کسی دوسری فقہ پر عمل کرنے کی اجازت خود فقہائے احناف نے دی ہے۔ اسی اجازت کی وجہ سے یہ سہولتیں عورتوں کو دی جا رہی ہیں جو فقہ حنفی میں نہیں ہیں۔

یہاں یہ مثال پیش کرنے سے مقصود یہ ہے کہ بیک وقت دی گئیں تین طلاقوں کو نافذ کر کے دفعتاً میاں بیوی کے درمیان علیحدگی کا فیصلہ کر دینا بھی ایک ایسا مسئلہ ہے جس سے بے شمار پیچیدگیاں اور معاشرتی مسائل پیدا ہو رہے ہیں جس کی کچھ تفصیل راقم کی محولہ بالا کتاب میں موجود ہے۔ اس کے حل کے لئے بھی ضروری ہے کہ موجودہ علمائے احناف مولانا تھانوی کی طرح ایسا اقدام کریں کہ مسئلہ طلاقِ ثلاثہ کی وجہ سے مسلمان عورت جن آلام و مصائب کا شکار ہوتی ہے، اس سے محفوظ ہوا جائے اور وہ حل یہی ہے کہ زیر بحث طلاقِ ثلاثہ کو ایک طلاق رجعی شمار کریں جس کی پوری گنجائش شریعت میں بھی موجود ہے اور فقہ حنفی سمیت دیگر مذاہبِ ثلاثہ میں بھی ہے۔

آمدم برسر مطلب!

اس ساری تفصیل کے پیش کرنے سے اصل مقصود یہ ہے کہ مسئلہ طلاقِ ثلاثہ میں یہ پوری گنجائش موجود

---

[1] الحیلة الناجزة: ص10، دارالاشاعت کراچی

ہے کہ اسے ایک طلاقِ رجعی شمار کر کے خاوند کو عدت کے اندر صلح اور رجوع کرنے کا حق دیا جائے تا کہ گھر اُجڑنے سے بچ جائے لیکن علمائے احناف اپنے فقہی جمود کی وجہ سے یہ معقول راستہ اختیار کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں جس کی وجہ سے پاکستان اور بھارت دونوں ملکوں میں بے شمار خاندان اس جمود کا شکار ہو کر اُجڑ چکے ہیں اور آئے دن یہ سلسلہ جاری رہتا ہے، حتیٰ کہ نوبت بہ ایں جا رسید کہ بھارتی سپریم کورٹ نے اس طریقۂ طلاق کو سب سے بدترین قسم قرار دیا اور پھر بالآخر اس کو غیر قانونی بھی قرار دے دیا۔ (یہ دونوں خبریں آخر میں ملاحظہ کریں)

بھارتی مسلمانوں کے 'مسلم پرسنل لا بورڈ' نے اس فیصلے کو ردّ کر دیا ہے کیونکہ ان کے نزدیک یہ مسلمانوں کے مذہب میں مداخلت ہے، ان کے مطابق بھارتی آئین بھی ہر مذہب کے ماننے والوں کو اپنے اپنے مذہب کے مطابق فیصلے کرنے کا حق دیتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی بورڈ کے سیکرٹری جنرل مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے کہا ہے کہ مسلمانوں میں طلاق کی شرح بالکل نہ ہونے کے برابر ہے، اس لئے اس مسئلے کی آڑ میں ہندو لابی یکساں سول کوڈ لانا چاہتی ہے، ورنہ سرے سے یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔

ہم موصوف کی اس رائے سے تو متفق ہیں کہ یکساں سول کوڈ کے خلاف بھرپور مزاحمت کی جائے، یہ بھارتی مسلمانوں کا مذہبی حق بھی ہے اور آئینی طور پر بھی درست ہے۔ لیکن اس رائے سے اتفاق مشکل ہے کہ سرے سے یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے اور طلاق کی شرح نہ ہونے کے برابر ہے۔ ہم پاکستان میں بھی سالہا سال سے دیکھ رہے ہیں کہ ایک مجلس کی تین طلاقوں کی وجہ سے گھر اُجڑ رہے ہیں، بچے اور عورتیں بے سہارا ہو رہی ہیں۔ اور ہم سمجھتے ہیں اور اس کے ٹھوس شواہد موجود ہیں کہ بھارت میں بھی اس مسئلے کی وجہ سے مسلمان عورتیں اور بچے مظلومیت کا شکار ہیں۔ اس لئے مسلم پرسنل لا بورڈ، ہند کا یہ دعویٰ کہ یہ مسئلہ ہی نہیں ہے، شتر مرغ کی طرح سر ریت میں چھپانے سے مختلف نہیں ہے۔

یہ بھی بتلایا گیا ہے کہ مسلم پرسنل لا بورڈ نے ایک دستخطی مہم شروع کی ہے جس میں مسلمان عورتوں سے یہ

عہد لیا جا رہا ہے کہ ہم شریعتِ اسلامیہ ہی کی روشنی میں اپنا ہر فیصلہ کرنا پسند کرتی ہیں۔ اس مہم کے مطابق پانچ کروڑ مسلمان عورتوں کے دستخط حاصل کر کے حکومتِ ہند کو پیش کیے جا چکے ہیں۔

یہ بھی اپنی جگہ بالکل درست اور مسلمانوں سے شریعت پر استقامت کا عہد بھی اچھا ہے اور حکومت پر یہ واضح کرنا نہایت ضروری ہے کہ مسلمان اپنے مذہب میں حکومت کو مداخلت کی ہرگز اجازت نہیں دیں گے۔ لیکن ہم عرض کریں گے کہ اس جدوجہد کے ساتھ ساتھ اصل مسئلے سے اغماض نہ برتا جائے اور اس سے پیدا ہونے والی پیچیدگیوں اور خرابیوں کو نظر انداز نہ کیا جائے بلکہ منظّم انداز میں اس کا ازالہ کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ مسلمانوں میں غلط طریقۂ طلاق سے آئے دن ظلم وستم کی جو صورتیں رونما ہوتی رہتی ہیں جس کا نشانہ زیادہ تر عورتیں ہی بنتی ہیں، اس کا مستقل مداوا ہو سکے اور وہ طریقہ وہی ہے جو خود متعدد علمائے احناف نے بھی تجویز کیا ہے جس کی تفصیل گزشتہ صفحات میں گزری۔

پس چہ باید کرد

اس مرحلے میں یہ ضروری ہے کہ جس طرح مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم نے زوجۂ مفقود الخبر کے بارے میں حنفی مسلک چھوڑ کر مالکی مسلک کو اختیار کیا اور اس پر دیگر علمائے احناف کو بھی قائل کیا، بالکل اسی طرح بھارت کے علمائے احناف کو متفق ہو کر ایک مجلس کی تین طلاقوں میں جو گنجائش خود حنفی علما نے اپنی فقہ حنفی ہی کی روشنی میں بیان کی ہے، اسے اختیار کرنا چاہیے۔

پاک و ہند کی مسلمان عورتوں پر یہ اسی قسم کا ایک بڑا احسان ہوگا جو آج سے 88 سال قبل ہندوستان ہی میں ہندوستانی علمائے احناف نے متحد ہو کر اور ایک موقف اپنا کر مسلمان عورتوں پر کیا تھا۔

وما علینا الا البلاغ المبین

مسلمانوں میں تین طلاقیں نکاح ختم کرنے کی بدترین قسم ہے۔ بھارتی سپریم کورٹ

نئی دہلی (آواز نیوز) بھارتی سپریم کورٹ نے بیک وقت تین طلاقوں کو مسلمانوں میں نکاح ختم کرنے کی سب سے بدترین اور نامناسب قسم قرار دے دیا ہے۔ بھارتی سپریم کورٹ کے چیف جسٹس جے ایس کھیہر کی سربراہی میں پانچ رکنی بنچ نے بیک وقت تین طلاقوں کے حوالے سے کیس کی سماعت کی۔ سابق بھارتی وزیر سلمان خورشید نے عدالت کو بتایا کہ بیک وقت تین طلاقوں کے لئے عدالتی جانچ پڑتال کی ضرورت نہیں ہوتی اور یہ کہ خواتین کے پاس اس بات کا اختیار ہوتا ہے کہ وہ شادی کے وقت نکاح نامے میں یہ شرط عائد کر دیں کہ بیک وقت تین طلاقیں اُنہیں نامنظور ہیں۔ عدالت نے سابق وفاقی وزیر سے کہا کہ ایسے اسلامی اور غیر اسلامی ممالک کی فہرست پیش کریں جہاں بیک وقت تین طلاقیں دینے پر پابندی عائد ہے جس پر بنچ کو بتایا گیا کہ پاکستان، افغانستان، مراکش اور سعودی عرب میں قانونی طور پر نکاح کے خاتمے کے لئے بیک وقت تین طلاقیں دینے کی اجازت نہیں ہے۔ سینئر وکیل رام جیٹھ ملانی نے عدالت میں موقف اختیار کیا کہ بیک وقت تین طلاقیں دینا آئینی بنیادوں پر بھی مساویانہ حقوق پر حملہ ہے۔ اُنہوں نے مزید کہا کہ بیک وقت تین طلاقیں دینے کا حق صرف شوہر کو حاصل ہے جو آئین کے آرٹیکل 14 کی خلاف ورزی ہے۔ رام جیٹھ ملانی کا کہنا ہے کہ اس طرح طلاق دینے کا طریقۂ کار بے رحمانہ اور قرآنِ کریم کے اصولوں کے بھی خلاف ہے جس کی کسی بھی صورت میں وکالت نہیں کی جاسکتی۔ تین طلاقوں سے متاثرہ خاتون کے وکیل نے عدالت کو بتایا کہ دنیا کا کوئی بھی قانون شوہر کی خواہش پر بیوی کو سابقہ بیوی بنانے کی اجازت نہیں دیتا اور یہ لاقانونیت کی سب سے بری قسم ہے۔ عدالت نے فریقین کے دلائل سننے کے بعد ریمارکس دیئے کہ باوجود اس کے کہ مسلمانوں کے کچھ مسالک میں بیک وقت تین طلاقیں دینا جائز ہے لیکن پھر بھی بیک وقت تین طلاقیں دے کر نکاح ختم کرنے کا عمل مسلمانوں میں نکاح ختم کرنے کی سب سے بدترین قسم ہے۔''

(روزنامہ آواز، لاہور: 13 رمئی 2017ء)

بھارتی سپریم کورٹ نے اکٹھے 3 طلاقوں کو غیر قانونی قرار دے دیا!

معاملہ قانون سازی کے لئے اسمبلی بھیجنے کی تجویز

نئی دہلی (آواز نیوز) بھارتی سپریم کورٹ نے مسلمانوں میں تین طلاق کو غیر قانونی قرار دے دیا۔ سپریم کورٹ کے 5 رکنی بنچ نے تین طلاق کے خلاف دائر درخواست کی سماعت کی جب کہ عدالت نے تین طلاقوں کو مسلم خواتین کے حقوق کے خلاف قرار دیتے ہوئے اسے غیر قانونی قرار دے دیا۔ پانچ رکنی ججز میں سے تین ججز نے تین طلاقوں کو آئین سے متصادم جب کہ بھارت کے چیف جسٹس سمیت دو ججز نے اس معاملے کو قانون سازی کے لئے اسمبلی میں بھیجنے کی رائے دی۔ چیف جسٹس جے ایس کھیہر اور جسٹس ایس عبدالنظیر نے قرار دیا کہ تین طلاق کا معاملہ مسلم مذہب کا بنیادی حق ہے اور یہ غیر قانونی نہیں۔ جسٹس کورین جوزف، جسٹس آر ایف ناریمان اور جسٹس یو یو لالت نے تین طلاقوں کو مسلم خواتین کے بنیادی حقوق کی خلاف ورزی اور غیر قانونی قرار دیا۔ بھارتی چیف جسٹس نے ذاتی رائے دیتے ہوئے اور درخواست کو مسترد کرتے ہوئے کہا کہ اس معاملے کو حکومت کے پاس بھیج دیا جائے اور حکم دیا کہ چھ ماہ میں تین طلاقوں پر قانون سازی کی جائے۔ تاہم حتمی فیصلے میں ججز کی تین دو سے رائے آنے کے بعد اکثریت کو سامنے رکھتے ہوئے پانچ رکنی بنچ نے تین طلاقوں کو غیر قانونی قرار دیا۔ عدالتی فیصلے کے بعد تین طلاقوں کے خلاف درخواست گزار شیارا بانو کا کہنا تھا کہ آج میں خود کو آزاد محسوس کر رہی ہوں۔ عدالتی فیصلے سے بہت سی مسلم خواتین کو آزادی ملے گی۔ شیارا بانو نے دعویٰ کیا کہ بہت سے مسلم ممالک میں تین طلاقوں پر پابندی ہے۔ دوسری جانب بھارت میں سرگرم مسلم تنظیموں کا کہنا ہے کہ ریاست کو مذہب میں مداخلت کا کوئی اختیار نہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ ہندو اکثریت معاشرے میں بڑھتے مسلم اثر و رسوخ سے خوفزدہ ہے۔

(روزنامہ 'آواز' لاہور: 23/ اگست 2017ء)

ایک مجلس کی تین طلاقوں کا صحیح حل

وزارت قانون اور نظریاتی کونسل کی خدمت میں

گزشتہ سطور میں راقم نے بھارتی سپریم کورٹ کے اس فیصلے کی تحسین کی ہے جس میں اس نے مسلم معاشرے میں بیک وقت تین طلاقیں دینے کے بڑھتے ہوئے رجحان کو روکنے کے لیے اسے طلاق کا بدترین طریقہ اور پھر اسے غیر قانونی قرار دیا تھا اور حکومت کو تاکید کی تھی کہ وہ اس سلسلے میں قانون سازی کرے۔

مسلم پرسنل لا بورڈ (ہند) نے اس فیصلے کی مذمت کی تھی اور اسے مسلمانوں کے مذہب میں مداخلت اور اس اعتبار سے بھارت میں مسلمانوں کو غیر محفوظ قرار دیا تھا۔[1]

یہ بات بلاشبہ صحیح ہے کہ بھارت کے سیکولر آئین کے رو سے بھارتی حکومت کو مسلم پرسنل لا میں مداخلت کا حق حاصل نہیں ہے۔ لیکن مسلمان عورتیں بھی بھارت کی شہری ہیں، جب مسلمان مردوں کی طرف سے ان پر ظلم روا رکھا جائے گا اور تسلسل سے کیا جائے گا اور مسلمان رہنماؤں کی طرف سے اس کے ازالے اور سدّ باب کے لیے کوئی معقول کوشش نہیں کی جائے گی تو پھر بھارتی عدالتوں اور بھارتی حکومت کی ذمے داری بنتی ہے کہ وہ اس ظلم کے سدّ باب کے لیے کوئی طریق کار تجویز کرے۔

اس لیے بھارت کے مذہبی پیشواؤں کا اس کو مذہب میں مداخلت قرار دینا، گو ایک حد تک درست ہے لیکن انہیں یہ سوچنا چاہیئے کہ انہوں نے مسلمان عورتوں کو اس ظلم سے بچانے کے لیے کچھ کیا ہے؟ وہ تو اپنے فقہی خول میں بند ہیں اور اس سے باہر نکلنا انہیں پسند ہی نہیں ہے جبکہ اس مسئلے کے حل کے لیے فقہی جمود

[1] روزنامہ آواز، 13 فروری، 2018ء

کے بجائے فقہی توسع کی ضرورت ہے جس کی مثالیں ہم نے اپنے گزشتہ مضمون میں پیش بھی کی تھیں، اس اعتبار سے بھارت کے مسلمان مذہبی پیشواؤں سے یہی کہا جاسکتا ہے کہ ۔

اے بادِصبا ایں ہمہ آوردۂ تُست

ایک دوسرا رخ: بھارتی حکومت نے اپنی عدالت عُظمیٰ کے فیصلے کی روشنی میں مسئلہ زیر بحث میں قانون سازی کی کہ جو مسلمان بیک وقت تین طلاقیں دے گا، اس کو تین سال قید اور جرمانہ ہوگا۔قومی اسمبلی (لوک سبھا) سے پاس ہوکر جب یہ قانون ایوانِ بالا (راجیہ سبھا) میں گیا تو اس پر بجا طور پر یہ اعتراض ہوا کہ تین برس کی مدت میں اس کے گھر کا محافظ اور بیوی بچوں کے نان نفقہ کا ذمے دار کون ہوگا؟ یہ اعتراض چونکہ نہایت وزنی ہے اوراس کے حل کیے بغیر اس قانون پر عمل درآمد بہت سی خرابیوں اور پیچیدگیوں کا باعث ہوگا۔اس لیے راجیہ سبھا میں یہ قانون پاس نہیں ہوسکا، اور بلاشبہ پاس ہونا بھی نہیں چاہیے۔

اس کا اصل حل یہ ہے جو کہ ہم نے گزشتہ سطور میں بھی پیش کیا ہے اور متعدد علمائے احناف کے تائیدی فتاوے اور آراء بھی پیش کی ہیں اور اب پھر پیش کر رہے ہیں کہ اس کا آسان اور صحیح حل یہی ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاقوں کو ایک طلاق رجعی شمار کیا جائے۔ اس صورت میں گھر بھی اجڑنے سے محفوظ رہیں گے، عورتوں پر ظلم وستم کا راستہ بھی بند ہوجائے گا اور معصوم بچے باپ کے ہوتے ہوئے بے سہارا نہیں ہوں گے۔

علاوہ ازیں یہ ایسا حل ہے جس میں شریعت سے کوئی تجاوز یا انحراف نہیں ہوتا بلکہ حنفیت سے بھی خروج لازم نہیں آتا جس کی ضروری تفصیل گزشتہ مضمون میں موجود ہے۔

بھارت کے علمائے احناف کو چاہیے کہ وہ بھارتی حکومت کے سامنے ایک مجلس کی تین طلاقوں کا یہ حل پیش کریں تا کہ صحیح قانون بنے اوراس قانون سے بچ جائے جو تجویز کیا گیا ہے اور جو اپنی غیر معقولیت کی وجہ سے پاس بھی نہیں ہوسکا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی قانون، الٰہی قانون کا مقابلہ نہیں کرسکتا، نہ انسانی قانون انسانی مسائل کو حل ہی کرسکتا ہے۔ انسانی مسائل کا حل اللہ کے بتلائے ہوئے قوانین کے اختیار کرنے ہی میں مضمر ہے کیونکہ

اللہ تعالیٰ ہی انسانی فطرت کا خالق ہے اور اس کے قوانین ہی انسانی فطرت کے عین مطابق ہیں۔ اور ایک مجلس کی تین طلاقوں کو ایک ہی طلاق رجعی شمار کر کے خاوند کو عدت کے اندر رجوع کا حق دینا عین منشائے الٰہی ہے جو قرآن کریم کی آیت ﴿اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ﴾ (البقرہ:229) سے واضح ہے۔

پاکستان میں بھی یہ مسئلہ اپنی شدت، وسعت اور سنگینی کے اعتبار سے کافی اہمیت کا حامل ہے لیکن یہاں بھی چونکہ وہی فقہی جمود ہے، جس میں بھارت کے حنفی علما مبتلا ہیں، اس لیے یہاں بھی یہ مسئلہ عورتوں اور بچوں پر ظلم وستم کا ذریعہ بنا ہوا ہے۔

پاکستان کی اسلامی نظریاتی کونسل نے دو تین مرتبہ مختلف اوقات میں اس کے لیے تعزیری سزا تجویز کرنے کی سفارش کی ہے لیکن عملاً کچھ نہیں ہوا۔ اب ایک مرتبہ پھر بھارتی حکومت کی مذکورہ مساعی کے پیش نظر اس نے جھرجھری لی ہے اور اس کے موجودہ چیئرمین قبلہ ڈاکٹر ایاز صاحب نے اس کے لیے وزارت قانون کو قانون سازی کی ہدایت کی ہے جس کی روشنی میں کونسل بھی اس پر غور کرے گی۔ اور اس کے لیے سزا تجویز کرے گی۔ [1]

لیکن پاکستان کی وزارتِ قانون اور اسلامی نظریاتی کونسل دونوں سے ہماری استدعا ہے کہ وہ اس کے لیے تعزیری سزا تجویز کرنے کے بجائے، اس کو ایک طلاق شمار کرنے کا قانون بنائے اور بھارتی حکومت کی نقالی نہ کرے تعزیری سزا سے یہ مسئلہ حل ہونا نہایت مشکل ہے، البتہ ہمارے بتلائے ہوئے شرعی حل سے بہت حد تک یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ کیونکہ تعزیری سزا انسانی حل ہے اور اسے ایک ہی طلاق شمار کرنا شرعی حل ہے۔ اگر یہ دونوں ادارے واقعی اس مسئلے کے حل میں مخلص ہیں تو اس کے بغیر چارہ نہیں ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاقوں کو ایک طلاق رجعی شمار کرنے کا قانون بنایا جائے۔

---

[1] روزنامہ آواز، لاہور 10 فروری 2018ء

انسانی قانون اورالٰہی قانون میں فرق کی ایک واضح مثال

انسانوں کے بنائے ہوئے قانون اور شریعت کے بتلائے قانون میں جتنا عظیم فرق ہے اوران دونوں کے مؤثر یا غیر مؤثر ہونے کا جو تعلق ہے، اس کا اندازہ ایک مثال اور واقعے سے بہ آسانی لگایا جاسکتا ہے۔

روزنامہ ''جنگ'' کے کالم نگار خلیل احمد نینی تال والا نے، اپنے ایک کالم میں شاہ فیصل کا یہ واقعہ نقل کیا ہے، موصوف لکھتے ہیں:

''آج سے 40 چالس سال قبل مرحوم شاہ فیصل سے دورۂ امریکہ میں ایک مشہور یونیورسٹی میں ایک پروفیسر نے سوال کیا کہ سعودی عرب میں سزائے موت کیوں ہے جبکہ امریکہ جیسے مہذب ملک میں قتل کے بدلے قید کی سزا ہوتی ہے۔اس کے جواب میں مرحوم شاہ فیصل نے 2 دلائل دیئے پہلا آپ کا قانون مظلوم کو انصاف دینے کے بجائے ظالم کو بچانے کے بہانے ڈھونڈتا ہے۔اورصرف ایک کمزور دلیل پر رہا کردیتا ہے جس وجہ سے صرف نیویارک میں ہرسال 10 ہزار سے زیادہ بچیوں اور خواتین کے ساتھ زیادتی ہوتی ہے اور ملزم چند سال گزار کر رہا ہوجاتا ہے انہوں نے بتایا کہ صرف نیویارک میں 8 ہزار سے زیادہ اس سال قتل ہوچکے ہیں۔ جواب میں پانچ ہزار کے قریب افراد پکڑے گئے جن کو 14 سال کی سزا ہوئی جو کٹ کر آدھی رہ جائے گی۔ بتایا جائے مقتول کو کہاں انصاف ملا۔ جبکہ نیویارک سے پانچ گنا بڑا ملک سعودی عرب میں پورے سال میں 10 قتل ہوئے ہم نے ان 10 قاتلوں کو چند ہفتوں میں مجرم ثابت کرکے ان کے سر قلم کردیئے۔ ایک طرف مقتول خاندان کو انصاف مل گیا تو دوسری طرف کروڑوں افراد کو سبق مل گیا کہ قاتل بچ نہیں سکتا اور قتل کرنے سے پہلے 100 دفعہ سوچے گا، بتائیں صرف 10 افراد کی قربانی دے کر ہم نے کروڑوں افراد کو تحفظ فراہم کرکے مثال قائم کردی ہے۔ آپ کا مہذب معاشرہ 5 ہزار افراد کو سزائیں دے کر بھی تحفظ فراہم نہ کرسکا تو ظالم آپ ہوئے یا ہم۔۔۔۔''[1]

❁ ❁ ❁ ❁ ❁ ❁ ❁

[1] روزنامہ جنگ لاہور، 4 فروری 2018

موزوں اور جرابوں پر مسح کے احکام و مسائل

حافظ صلاح الدین یوسف [1]

احادیث میں موزوں اور جرابوں کے لیے خفین، نعلین، جورب اور تساخین کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اول الذکر دو الفاظ عام طور پر چمڑے کے موزوں کے لیے اور ثانی الذکر الفاظ سوتی، اُونی اور چمڑے کی جرابوں کے لیے استعمال کرتے ہیں بلکہ اہل لغت کی صراحت کی رُو سے ہر وہ چیز جورب ہے جسے لفافے کی طرح پاؤں میں پہن لیا جائے اور جس سے پاؤں ڈھک جائیں۔

اس تعریف کی رُو سے جرابیں سوت کی بنی ہوئی ہوں یا نیلون کی، اُون کی ہوں یا چمڑے کی، سب پر جورب کا اطلاق صحیح ہے۔ اور جرابوں پر مسح کرنا احادیث سے ثابت ہے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی خفین پر مسح کیا ہے۔ [2]

اور اہل لغت نے خفین کو بھی جوربین میں شامل کیا ہے۔

ہماری اس بات کی تائید سیدنا انس رضی اللہ عنہ کے ایک اثر سے بھی ہوتی ہے جو صحیح سند سے مروی ہے، جس کی سند کو علامہ احمد شاکر رحمہ اللہ نے "جید" قرار دیا ہے اور اس اثر کو ترمذی کے حاشیے پر نقل فرمایا ہے، وہ اثر یہ ہے: ازرق بن قیس بیان کرتے ہیں کہ میں نے سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ وہ بے وضو ہو گئے تو

[1] مشیر وفاقی شرعی عدالت، نگران شعبہ تحقیق و تصنیف المدینہ اسلامک ریسرچ سینٹر کراچی

[2] صحیح البخاری، رقم الحدیث: 206

انہوں نے وضو کیا، اپنا چہرہ اور ہاتھ دھوئے اور اُونی جرابوں پر مسح کیا، میں نے ان سے کہا: آپ ان جرابوں پر مسح کر رہے ہیں! تو انہوں نے فرمایا:

"انهما خفان ولكنهما من صوف۔" [1] "یہ بھی موزے ہیں لیکن اُون کے ہیں۔"

علامہ احمد شاکر مصری رحمہ اللہ یہ اثر نقل کر کے لکھتے ہیں:

"وهذا الأ ثر عن انس يدل على أنه،وهو من أهل اللغة،يرى أن الجوربين يطلق عليهما اسم الخفين أيضاً،وأنّ المقصود من ذلک مايستر الرجلين،من غير نظر الیٰ ما يصنع منه،جلداً أوصوفا أوغير ذلک۔" [2]

"سیدنا انس رضی اللہ عنہ کا یہ اثر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ان کے نزدیک جرابوں پر خفین (موزوں) کا اطلاق بھی صحیح ہے اور سیدنا انس رضی اللہ عنہ اہل زبان میں سے ہیں (اس لیے ان کی بات معتبر ہے) اور اس سے مقصود ایسی چیز ہے جو پیروں کو ڈھانپ لے، قطع نظر اس کے کہ وہ کس چیز کی بنی ہوئی ہے چمڑے کی ہے یا اُون کی یا اُون کے علاوہ کسی اور چیز کی۔"

جرابوں پر مسح کرنے کی واضح ہدایت

علاوہ ازیں سیدنا مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ ہی سے ایک روایت ترمذی میں موجود ہے جس میں نعلین کے ساتھ جرابوں پر بھی مسح کرنے کا ذکر ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

"توضأ النبي صلی اللہ علیہ وسلم ومسح على الجوربين والنعلين۔" [3]

"نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وضو فرمایا اور جرابوں اور (چمڑے کے) موزوں اور (جوتوں) پر مسح کیا۔"

امام ترمذی نے بھی اس حدیث کو حسن صحیح کہا ہے اور ان کے علاوہ دیگر محققین حدیث نے بھی

---

[1] سنن الترمذی،بتحقیق احمد محمد شاکر،ج/1،ص/169

[2] سنن الترمذی،بتحقیق احمد محمد شاکر،ج/1،ص/169،حدیث:99

[3] جامع الترمذی،کتاب الطھارۃ،باب ماجاء فی المسح علی الجوربین والنعلین،حدیث:99

ان کی تائید کی ہے کیونکہ سیدنا مغیرہ رضی اللہ عنہ کی یہ روایت صحیح بخاری میں بھی ہے لیکن ترمذی میں یہ روایت جرابوں پر مسح کرنے کے اضافے کے ساتھ ہے۔اس اضافے کو بیان کرنے والا راوی ثقہ ہے اور ثقہ راوی کا اضافہ محدثین کے نزدیک بالاتفاق صحیح ہوتا ہے، چنانچہ ان مسلمہ اصولوں کی روشنی میں علامہ احمد شاکر مصری، علامہ جمال الدین قاسمی، امام العصر شیخ البانی، امام ابن دقیق العید وغیرہم رحمهم الله نے اس حدیث کو صحیح قرار دے کر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے موزوں کے ساتھ جرابوں پر بھی مسح کرنے کا اثبات کیا ہے۔اور سیدنا مغیرہ رضی اللہ عنہ کی بیان کردہ روایت کو مختلف مواقع پر محمول کیا ہے، یعنی یہ کسی ایک ہی وقت کا واقعہ نہیں ہے لیکن مختلف واقعات ہیں، کسی وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے موزوں پر اور کسی وقت جرابوں پر مسح فرمایا ہے۔"[1]

صاحبین امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ کی رائے

اسی حدیث، مسح علی الجوربین، کی وجہ سے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے دونوں شاگردوں، امام محمد اور قاضی ابو یوسف نے بھی اپنے استاد امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے اختلاف کرتے ہوئے موٹی جرابوں پر مسح کرنے کا جواز تسلیم کیا ہے۔ ہدایہ میں ہے:

"ولا يجوز المسح على الجوربين عند أبي حنيفة إلا أن يكونا مجلّدين أومنعلين،وقالا يجوز إذا كانا ثخينين لا يشفان لما روى ان النبي عليه الصلاة والسلام مسح على جوربيه۔"[2]

"امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک جرابوں پر مسح جائز نہیں۔ ہاں اگر وہ مجلد یا منعل ہوں تو جائز ہے اور صاحبین (امام محمد اور ابو یوسف) نے کہا: جرابوں پر مسح جائز ہے اگر وہ موٹی ہوں، باریک نہ ہوں، اس لیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے جرابوں پر مسح کیا ہے۔"

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیں: تعلیقات أحمد شاکر علی جامع الترمذی:1/ 167-196، ارواء الغلیل:1/ 137-138، المحلی لابن حزم:2/ 84-87

[2] الهداية فی شرح بداية المبتدی:1/ 35

علاوہ ازیں فقہ حنفی کی متعدد کتابوں میں امام صاحب کا اپنے مسلک سے رجوع کر کے اپنے دونوں شاگردوں کی رائے کو اختیار کر لینے کا ذکر ہے اور اس کی تفصیل یہ لکھی ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ وفات سے 9 یا 3 دن پہلے بیمار ہو گئے تھے تو انہوں نے جرابوں پر مسح کیا اور مزاج پرسی کرنے والوں سے فرمایا:

”فعلت ماكنت أمنع الناس عنه۔“

”آج میں نے وہ کام کیا ہے جس سے میں لوگوں کو منع کرتا تھا۔“

اس واقعے کو نقل کر کے فقہائے احناف لکھتے ہیں:

”فاستدلوا به على رجوعه۔“

”اس سے فقہاء نے یہ استدلال کیا ہے کہ امام صاحب نے اپنی رائے سے رجوع کر لیا تھا۔“

اور اتنا ہی نہیں، بلکہ ہدایہ وغیرہ میں یہاں تک لکھا ہوا ہے۔

”وعليه الفتوىٰ“ ”اور اب فتویٰ بھی اسی (رجوع والے مذہب) ہی پر ہے۔“[1]

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا اپنی رائے سے رجوع کرنے کا ذکر امام ترمذی رحمہ اللہ نے بھی اپنی جامع ترمذی میں کیا ہے جو مصری محدث ومحقق کے نسخۂ ترمذی میں موجود ہے اور علامہ بنوری بھی نے اپنی شرح ”معارف السنن“ میں اس کو تسلیم کیا ہے۔

اس کے بعد تو فقہائے احناف کو جرابوں پر مسح کرنے سے انکار نہیں کرنا چاہیے کیونکہ ان کے تینوں بڑے امام اس کے قائل ہیں اور فتویٰ بھی اسی رائے پر ہے۔ اس کے بعد انکار کا کیا جواز ہے؟

ثخانت کا مسئلہ

باقی رہا مسئلہ ثخانت، یعنی موٹی ہونے کا کہ صاحبین کے نزدیک یہ جواز تب ہے جب جرابیں موٹی ہوں، باریک نہ ہوں۔ یہ مسئلہ بھی ثخانت کی اس تعریف سے حل ہو جاتا ہے جو خود فقہاء نے ثخانت (موٹے ہونے) کی ہے:

---

[1] الهداية: صفحہ مذکورہ، الجوهرة النيرة شرح مختصر القدوري: 1/ 69

''وهو أن يستمسک علی الساق من غير أن يربط بشیء۔''

''ثخین (موٹی) سے مراد وہ جراب ہے جو پنڈلی پر کسی چیز کے ساتھ باندھنے کے بغیر ٹھہر جائے۔''

''والثخينين ما يستمسک بالقدم من غير رباط۔''[1]

''موٹی جرابیں وہ ہیں جو پیر کے ساتھ بغیر کسی رسی (وغیرہ) کے باندھے، ٹھہر جائیں۔''

اس تعریف کی رُو سے ہر قسم کی جراب، چاہے وہ اُونی ہو یا سوتی یا نائیلون کی، موٹی ہو یا پتلی، ہر جراب پاؤں اور پنڈلیوں پر خود بہ خود ٹھہر جاتی ہے، اسے کسی چیز سے باندھنا نہیں پڑتا۔

اس مسلّمہ تعریف کے بعد موٹی اور پتلی کی بحث کا بھی کوئی جواز نہیں رہتا، ہر قسم کی جراب پر جو قدم کو ڈھانکے اور جلد نظر نہ آئے، مسح کا جواز ثابت ہوجاتا ہے۔ احادیث میں تو پہلے ہی اس شرط اور تفریق کا کوئی اشارہ نہیں ملتا، ان میں تو مطلق جوربین (جرابوں) کا ذکر ہے جس میں موٹی اور پتلی ہر قسم کی جراب شامل ہے۔ بلکہ جورب (جراب) کی تعریف سے بھی یہ مسئلہ حل ہوجاتا ہے:

''والجورب :لفافة الرجل يتخذ من غزل صوف أوقطن أو شعر لا ستدفاء القدم۔''[2]

''جورب پیر کا لفافہ (اس کو ڈھانپنے والی چیز) ہے جو اُون، یا روئی، یا بالوں سے بنائی جاتی ہے پیر کو گرم رکھنے کے لیے۔''

نعلین کی بھی یہی تعریف ہے، یعنی وہ بھی ''لفافة الرجل'' ہی ہے فرق صرف یہ ہے کہ وہ چمڑے کی بنی ہوئی ہوتی ہیں۔

اس لیے ایک اور حنفی عالم مولانا مودودی نے، جن کو اللہ نے اس مسئلے پر شرح صدر فرمایا، ہر قسم کی جرابوں پر مسح کرنے کا جواز تسلیم کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے:

---

[1] معارف السنن: 1/ 346

[2] ایضاً

''سوتی اور اُونی جرابوں کے معاملے میں عموماً ہمارے فقہاء نے یہ شرط لگائی ہے کہ وہ موٹی ہوں اور شفاف نہ ہوں کہ ان کے نیچے سے پاؤں کی جلد نظر آجائے اور کسی قسم کی بندش کے بغیر خود قائم رہ سکیں۔ میں نے اپنی امکانی حد تک یہ تلاش کرنے کی کوشش کی کہ ان شرائط کا ماخذ کیا ہے مگر سنت میں ایسی کوئی چیز نہ مل سکی۔ سنت سے جو کچھ ثابت ہے وہ یہ ہے کہ نبی ﷺ نے جرابوں اور جوتوں پر مسح فرمایا ہے۔۔۔۔(روایت لکھنے کے بعد لکھتے ہیں) اس روایت میں کہیں یہ نہیں ملتا کہ نبی ﷺ نے فقہاء کی تجویز کردہ شرائط میں سے کوئی شرط بیان فرمائی ہو۔ اور نہ ہی یہ ذکر کسی جگہ ملتا ہے کہ جن جرابوں پر حضور نے اور مذکورہ صحابہ نے مسح کیا، کس قسم کی تھیں۔ اس لیے میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ فقہاء کی عائد کردہ ان شرائط کا کوئی مأخذ نہیں ہے۔ اور فقہاء چونکہ شارع نہیں ہیں، اس لیے ان شرطوں پر اگر کوئی عمل نہ کرے تو وہ گناہ گار نہیں ہوسکتا۔

مسح علی الخفین پر غور کر کے میں نے جو کچھ سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ دراصل یہ تیمم کی طرح ایک سہولت ہے جو اہل ایمان کو ایسی حالتوں میں دی گئی ہے جب کہ وہ کسی صورت سے پاؤں ڈھکنے پر مجبور ہوں اور بار بار پاؤں دھونا ان کے لیے موجب نقصان یا وجہ مشقت ہو۔ اس رعایت کی بنا اس مفروضے پر نہیں ہے کہ طہارت کے بعد موزے پہن لینے سے پاؤں نجاست سے محفوظ رہیں گے۔ اس لیے ان کے دھونے کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ بلکہ اس کی بنا اللہ کی رحمت ہے جو بندوں کو سہولت عطا کرنے کی مقتضی ہوئی۔ لہٰذا ہر وہ چیز جو سردی سے یا راستے کی گرد وغبار سے بچنے کے لیے یا پاؤں کے کسی زخم کی حفاظت کے لیے آدمی پہنے اور جس کے بار بار اُتارنے اور پہننے میں آدمی کو زحمت ہو اس پر مسح کیا جاسکتا ہے خواہ وہ اُونی جراب ہو یا سوتی، چمڑے کا جوتا ہو یا کرمچ کا، یا کوئی کپڑا ہی ہو جو پاؤں پر لپیٹ کر باندھ لیا گیا ہو۔

میرے نزدیک دراصل یہی معنی مسح علی الخفین وغیرہ کی حقیقی روح ہیں اور اس روح کے

اعتبار سے وہ تمام چیزیں یکساں ہیں جنہیں ان ضروریات کے لیے آدمی پہنے جن کی رعایت ملحوظ رکھ کر مسح کی اجازت دی گئی ہے۔''[1]

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا طرزِ عمل اور فقہائے احناف کا جمود

یہی وہ حقیقی روح تھی جو بیماری میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی سمجھ میں آ گئی تھی اور انہوں نے اپنی رائے سے رجوع کر کے جرابوں پر مسح کر لیا، جس میں یہ وضاحت نہیں ہے کہ وہ جرابیں کس قسم کی تھیں؟ ظاہر بات ہے وہ مجلّدین یا منعلّین نہیں تھیں، جن کی وہ اس سے پہلے شرط لگایا کرتے تھے۔ مجلّدین وہ موزے جن کے اوپر نیچے چمڑا ہو اور منعلّین وہ موزے جن کا صرف نچلا حصہ چمڑے کا ہو۔ علاوہ ازیں حنفی فقہ کی معتبر کتابوں (ہدایہ وغیرہ) میں یہ صراحت بھی ہے کہ فتویٰ امام صاحب کے اخری عمل پر ہے۔ اس کے باوجود فقہائے احناف اور موجودہ علمائے احناف کا جمود نا قابل فہم ہے جو جرابوں پر مسح کرنے کی اجازت نہیں دیتے اور امت مسلمہ کو ایسی سہولت سے محروم کر رکھا ہے جو اللہ تعالیٰ نے عطا کی ہے اور صحیح احادیث سے ثابت ہے۔

علمائے احناف کا نا قابل فہم عذر

اگر وہ یہ کہیں کہ ہم امام صاحب کے رجوع کو اس لیے اہمیت نہیں دیتے کہ جرابوں پر مسح کرنے کی احادیث صحیح نہیں ہیں، صرف خفین پر مسح کرنے کی روایات صحیح ہیں۔

اولاً: ان کا یہ دعویٰ غیر صحیح اور ان کے عمومی طرزِ عمل کے خلاف ہے۔ اس لئے کہ ان کا عمومی طرزِ عمل تو یہ ہے کہ فقہ حنفی کے مسائل کو اہمیت دیتے ہوئے انہوں نے بے شمار صحیح احادیث کو مختلف حیلوں یا خانہ زاد اُصولوں کی بنیاد پر نا قابل عمل اور مردود ٹھہرا رکھا ہے۔ بنا بریں ان کا حدیث کو اہمیت دینے کے دعوے کو کیوں کر صحیح سمجھا جا سکتا ہے۔ اس مسئلے کی حد تک یہ صرف ان کا فقہی جمود اور اکابر پرستی کی ریت ہے جو ان

[1] رسائل ومسائل، حصہ دوم، ص:157-158 ملخصاً

کے ہاں بڑی مستحکم ہے۔

ثانیاً: سیدنا مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کو، جو جرابوں پر مسح کرنے کی دلیل ہے اور سنداً بالکل صحیح ہے، اپنے خودساختہ اصولوں کی بنیاد پر ضعیف یا قرآن کے خلاف ہونے پر ظنی اور خبر واحد کہہ کر ردّ کر دینا جیسا کہ مولانا بنوری نے کیا ہے، یہ ان کا وہی وتیرہ ہے جو متعدد احادیث کے بارے میں انہوں نے اختیار کر رکھا ہے۔

سیدنا مغیرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث صحیح ہے اور وہ قرآن کے خلاف نہیں ہے بلکہ قرآنی حکم ''غسل رجلین'' کی مُخصّص یا مُفسّر ہے جس سے قرآن کے ایک حکم کی تخصیص یا تفسیر ہوتی ہے کہ اگر طہارت کی صورت میں موزے یا جرابیں پہنی گئی ہوں تو ان پر مسح کرنا جائز ہے، اس حالت میں پاؤں دھونے کی ضرورت نہیں ہے، مقیم کو ایک دن۔ایک رات اور مسافر کو تین دن، تین راتیں۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل

امام خطابی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تیرہ (13) صحابہ سے جرابوں پر مسح کرنا ثابت ہے اور کسی صحابی سے ان کی مخالفت ثابت نہیں۔امام احمد رحمہ اللہ بھی اس کے جواز کے قائل ہیں اور ان کی بنیاد یہی صحابہ کا عمل اور صریح قیاس ہے کیونکہ موزوں اور جرابوں کے درمیان کوئی ایسا مؤثر فرق نہیں ہے جس کی بنا پر ان کے درمیان حکم میں کوئی فرق کرنا صحیح ہو۔

مذکورہ احادیث، آثارِ صحابہ، اہل لغت کی صراحت اور قیاس صریح سے واضح ہے کہ جرابوں اور موزوں پر مسح کرنا جائز ہے، چاہے وہ چمڑے کے ہوں یا اُون یا نائیلون کے، موٹے ہوں یا پتلے، ہر قسم کی جرابوں پر مسح کیا جا سکتا ہے، ان کے درمیان فرق کرنا صحیح نہیں ہے، بہ شرطیکہ جرابیں پہنتے وقت انسان باوضو ہو۔

مسح کرنے کی مدت

وضو کی حالت میں پہنی ہوئی جرابوں پر مقیم آدمی ایک رات اور ایک دن اور مسافر تین دن اور تین

راتیں مسح کر سکتا ہے، البتہ احتلام اور جنابت کی صورت میں یہ رخصت ختم ہو جائے گی کیونکہ ان صورتوں میں غسل واجب ہو جاتا ہے، البتہ قضائے حاجت سے یہ رخصت ختم نہیں ہوگی بلکہ برقرار رہے گی۔ اور مذکورہ مدت کے اندر مقیم اور مسافر پیر دھونے کی بجائے جرابوں پر مسح کر سکتے ہیں۔ [1]

مسح کے وقت کی ابتدا

موزوں پر مسح کی مدت کا آغاز وضو کرنے کے بعد سے نہیں ہوگا بلکہ اس وقت سے ہوگا جب وہ بے وضو ہونے کے بعد پہلی مرتبہ مسح کرے گا مثلاً نماز فجر کے وقت وضو کر کے جرابیں پہنیں، پھر گھنٹے دو گھنٹے کے بعد بے وضو ہو گیا لیکن اس نے ظہر کے لیے وضو کیا اور جرابوں پر مسح کر لیا تو اس مسح سے مسح کی مدت کا آغاز ہوگا اور اگلے دن کی ظہر تک مقیم کے لیے مسح کرنا جائز ہوگا۔ اس طرح گویا وہ چھ نمازوں کے لیے مسح کر سکے گا۔ [2]

ایک دوسری رائے یہ ہے کہ مسح کی ابتداء پہلی مرتبہ وضو کر کے جرابیں پہننے کے وقت سے ہوگی اس طرح صرف پانچ نمازوں کے لیے مسح کرنا جائز ہوگا یعنی ایک دن اور ایک رات۔ احتیاط اسی دوسری رائے میں ہے۔ واللہ اعلم

اگر کسی کھلے میدان میں نماز پڑھنی ہو اور جوتوں سمیت پڑھنی ہو تو جوتوں پر بھی مسح کرنا جائز ہے۔

---

[1] صحیح مسلم: 276، صحیح بخاری: 5788

[2] تفصیل کے لیے دیکھیے فتاویٰ اسلامیہ: 1 / 316-317

سجدہ سہو اور جماعت میں شریک ہونے کا بیان

الشیخ عبدالرحمٰن عزیز

سجدہ سہو امتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ کا عظیم احسان ہے کہ اس کے ذریعے نماز جیسے عظیم رکن میں انسانی بھول کی وجہ سے پیدا ہونے والے نقص کا ازالہ ہو جاتا ہے سجدہ سہو ہر قسم کی نماز میں بھول چوک پر واجب ہے، آدمی اکیلا نماز ادا کر رہا ہو یا با جماعت اور نماز فرض نماز ہو یا نفل، بھول چوک پر سجدہ سہو کیے بغیر نماز نہیں ہوگی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

''فَإِذَا نَسِيَ أَحَدُكُمْ فَلْيَسْجُدْ سَجْدَتَيْنِ۔''[1]

''جب تم میں سے کوئی شخص نماز میں بھول جائے تو اسے دو سجدے کرنے چاہیں۔''

'' فِي كُلِّ سَهْوٍ سَجْدَتَانِ بَعْدَ مَا يُسَلِّمُ۔''[2]

''ہر قسم کی بھول میں سلام پھیرنے کے بعد دو سجدے ہیں۔''

سلام سے قبل ایک سے زائد غلطیاں ہو جائیں تو ان کے لیے سہو کے دو سجدے ہی کافی ہیں اور نماز میں جان بوجھ کر کی جانے والی غلطی کا ازالہ سجدۂ سہو نہیں ہوگا۔ بلکہ نماز باطل ہو جائے گا۔

[1] صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب السهوفی الصلاة والسجود له:572/92

[2] سنن ابن ماجه،كِتَابُ إِقَامَةِ الصَّلَاةِ وَالسُّنَّةُ فِيهَا،بَاب مَا جَاءَ فِيمَنْ سَجَدَهُمَا بَعْدَ السَّلَامِ:حديث:1219

رکعات میں کمی بیشی پر سجدہ سہو

اگر کوئی رکعت چھوٹ گئی تو اس رکعت کو مکمل کرنے کے بعد سجدہ سہو کیا جائے گا۔ سیدنا ابوھریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دو رکعت پڑھا کر سلام پھیر دیا تو آپ سے ذوالیدین نے کہا کہ: یا رسول اللہ! کیا نماز مختصر ہوگئی ہے یا آپ بھول گئے ہیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا کہ کیا ذوالیدین سچ کہہ رہا ہے؟ لوگوں نے کہا: ہاں! یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کھڑے ہوئے اور باقی والی دو رکعات پڑھائیں، پھر سلام پھیرا، پھر '' اللہ اکبر '' کہہ کر سجدہ کیا، جو عام سجدوں کی مانند یا ان سے لمبا تھا، پھر اٹھے۔''[1]

❁ سیدنا عمران بن حصین رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ''ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عصر کی تین رکعتیں پڑھا کر سلام پھیر دیا، پھر اپنے گھر چلے گئے۔ ایک آدمی نے جسے خرباق کہا جاتا تھا، وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس گیا، اس نے اس چیز کا ذکر کیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غصہ کی حالت میں اپنی چادر کھینچتے ہوئے لوگوں کے پاس آئے اور ان سے پوچھا: ''کیا یہ شخص سچ کہتا ہے؟ انہوں نے کہا: ''ہاں'' آپ نے ایک رکعت پڑھائی، پھر سلام پھیرا، پھر دو سجدے کیے اور پھر سلام پھیرا۔''[2]

❁ اگر کوئی رکعت زیادہ پڑھ لی ہے تو اس پر بھی دو سجدے کیے جائیں گے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ظہر کی نماز پانچ رکعت پڑھا دی۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا ''کیا نماز زیادہ ہوگئی ہے؟'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''کیا بات ہے؟'' کہنے والے نے کہا '' آپ نے پانچ رکعتیں پڑھی ہیں'' تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سلام کے بعد دو سجدے کیے۔''[3]

اگر کوئی نماز میں بھول کر اضافی رکعت کے لیے کھڑا ہو گیا ہے تو جہاں یاد آئے وہیں سے پلٹ کر تشہد میں بیٹھ جائے اور آخر میں سجدہ سہو کر لے۔

---

[1] صحیح بخاری، حدیث: 1228۔ صحیح مسلم، حدیث: 99/573

[2] صحیح مسلم، حدیث: 574۔ ابوداؤد، حدیث: 1018

[3] صحیح بخاری، حدیث: 1226۔ صحیح مسلم، حدیث: 91

درمیانہ تشہد چھوٹ جانے پر سجدہ سہو

❁ اگر کوئی درمیانہ تشہد بھول جائے تو وہ سجدہ سہو کرے گا۔ سیدنا عبداللہ بن بحینہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں ظہر کی نماز پڑھائی اور دو رکعتوں پر بیٹھنے کے بجائے کھڑے ہو گئے، چنانچہ سارے لوگ بھی آپ کے ساتھ کھڑے ہو گئے، جب نماز ختم ہونے والی تھی اور لوگ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سلام پھیرنے کا انتظار کر رہے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ''اللہ أکبر'' کہہ کر سلام پھیرنے سے پہلے دو سجدے کیے، پھر سلام پھیرا۔''[1]

واضح رہے کہ اگر کوئی درمیانہ تشہد بھول گیا ہے اور وہ سیدھا کھڑا ہو گیا ہے تو وہ یاد آنے پر بیٹھے گا نہیں بلکہ نماز پوری کرے گا اور آخر میں سلام سے پہلے دو سجدے کرے گا۔ لیکن اگر وہ کھڑا ہونے لگا اور یاد آ گیا تو بیٹھ جائے گا اور اس غلطی پر دو سجدے نہیں۔ کیونکہ مذکورہ بالا عبداللہ بن بحینہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کی ایک روایت میں یہ بھی ہے: ''ہم نے ''سبحان اللہ'' کہا، پس جب آپ سیدھے کھڑے ہو گئے تو آپ نے قیام شروع کر دیا اور آپ واپس نہ لوٹے۔''[2]

❁ درمیانہ تشہد جہاں کرنا چاہیے تھا وہاں نہ کیا، یا جہاں نہیں کرنا چاہیے تھا وہاں کیا، تو سجدہ سہو لازم ہو گا۔

رکعات کی تعداد میں شک پر سجدہ سہو

❁ اگر رکعات کی تعداد میں شک پڑ جائے تو اس کی دو صورتیں ہوں گی، ایک یہ کہ اسے یقین نہیں آ رہا کہ آیا اس نے تین پڑھی ہیں یا چار اور دوسری شکل یہ ہے کہ شک پڑنے پر اس نے غور و خوض کیا اور اسے یقین آ گیا کہ اس نے تین پڑھی ہیں یا چار اس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

1 ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم میں سے کسی کو رکعات کی تعداد کے بارے میں شک پڑ جائے اور معلوم نہ ہو سکے کہ اس نے تین پڑھی ہیں یا چار تو وہ شک کو چھوڑ

---

[1] صحیح بخاری، حدیث: 829۔ صحیح مسلم، حدیث: 570

[2] صحیح ابن خزیمہ: 2/115، حدیث: 1031

دے اور یقینی بات پر بنیاد رکھے (یعنی تین پر) اور پھر سلام پھیرنے سے پہلے دو سجدے کرے، اب اگر اس نے پانچ رکعات پڑھی ہوگی تو یہ سجدے اس کی نماز (کی رکعات) کو جفت کر دیں گے اور اگر اس نے پوری چار رکعت نماز پڑھی ہوگی تو یہ سجدے شیطان کے لیے ذلت کا سبب ہوں گے۔"[1]

اور سیدنا عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "جب کسی کو دو اور ایک کے درمیان شک ہو جائے تو وہ ایک رکعت شمار کرے اور دو اور تین کے درمیان شک ہو جائے تو دو رکعتیں شمار کرے، اگر تین اور چار کے درمیان شک پڑ جائے تو تین رکعتیں شمار کرے، پھر نماز پوری کر لے، حتیٰ کہ شک اضافے کے بارے میں رہ جائے، پھر سلام پھیرنے سے پہلے بیٹھے بیٹھے دو سجدے کر لے۔"[2]

2 دوسری شکل یہ کہ اسے شک پڑا مگر غور و خوض کے بعد پتا چل گیا کہ اس کی کون سی رکعت ہے تو وہ ظن غالب پر بنیاد رکھے اور آخر میں دو سجدے کر لے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"إذا شك أحدكم في صلاته فليتحر الصواب فليتم عليه، ثم ليسلّم ثم يسجد سجدتين[3]۔"

"جب تم میں سے کسی کو اپنی نماز میں شک پڑ جائے تو وہ ٹھیک بات کو تلاش کرے اور اسی کے مطابق اپنی نماز پوری کرے، پھر سلام پھیر کر دو سجدے کر لے۔"

واضح ہے "فلیتحر الصواب" اور سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث کے الفاظ "ولیبن علی ما استیقن" کا معنی مختلف ہے، جیسا کہ مسلم کی حدیث میں جو مختلف چار الفاظ استعمال ہوئے ہیں، ان سے واضح ہوتا ہے اور یہ فرق حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری (3/95) میں بیان کیا ہے، اسی طرح امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ نے صحیح ابن خزیمہ (2/114) میں اور امام ابن حبان رحمہ اللہ نے صحیح ابن حبان میں، جبکہ امام نووی رحمہ اللہ اور دیگر علماء نے ان دونوں احادیث کا ایک ہی معنیٰ مراد لیا ہے۔

---

[1] صحیح مسلم، حدیث: 571

[2] سنن ابن ماجہ، حدیث: 1209۔ ترمذی، حدیث: 398

[3] صحیح بخاری، حدیث: 401، صحیح مسلم، حدیث: 572

جن غلطیوں پر سجدۂ سہو نہیں

❁ مندرجہ ذیل غلطیوں پر سجدۂ سہو نہیں کیا جائے گا:

1. کوئی جہالت کی وجہ سے نماز میں بات کرے۔ جان بوجھ کر بولنے والے کی نماز ٹوٹ جائے گی۔ سیدنا معاویہ بن الحکم السلمی رضی اللہ عنہ نے لاعلمی کی وجہ سے نماز میں کوئی بات کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بلاشبہ یہ نماز ہے، اس میں دنیا کی باتیں کرنا درست نہیں ہے۔''[1]

2. کوئی دعا زیادہ مرتبہ پڑھی گئی، یا دعا میں کوئی لفظ زیادہ پڑھا گیا۔ ایک آدمی نے نماز میں اپنی طرف سے ''رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ حَمْدًا كَثِيرًا طَيِّباً مُبَارَكًا فِيهِ'' پڑھ دیا، نماز کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا: ''یہ کلمات کس نے کہے تھے؟'' اس شخص نے کہا: ''میں نے!'' تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''میں نے تیس سے زیادہ فرشتے دیکھے جو اسے پہلے لکھنے میں مقابلہ کر رہے تھے۔''[2]

3. قراءت میں غلطی ہوگئی تو سجدۂ سہو لازم نہیں ہوگا۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قراءت بھولنے پر سجدۂ سہو نہیں کیا کرتے تھے۔[3]

فاتحہ کی قراءت رہ جائے تو

❁ اگر کوئی شخص کسی رکعت میں سورۂ فاتحہ کی قراءت بھول جائے تو وہ اس رکعت کو دوبارہ پڑھے اور پھر دو سجدے کرے، کیونکہ فاتحہ کے بغیر رکعت ہی نہیں ہوتی۔ اسی طرح رکوع یا سجدہ کرنا بھول جائے تو بھی پہلے وہ رکعت پڑھے، پھر دو سجدے کرے۔

---

[1] صحیح مسلم، حدیث: 537

[2] صحیح بخاری، کتاب الأذان، حدیث: 799

[3] ابوداؤد، حدیث: 907

امام و مقتدی کے احکام

❁ اگر امام بھول جائے تو مقتدی امام کو غلطی پر متنبہ کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

" فَإِذَا نَسِيتُ فَذَكِّرُونِي۔ "[1]

"جب میں بھول جاؤں تو مجھے یاد کروادیا کرو۔"

(اگر امام قراءت میں سے کچھ بھول جائے تو اسے بھولا ہوا لفظ بتانا چاہئے۔ اگر کوئی اور غلطی ہو جائے تو مرد "سبحان اللہ" کہہ کر اور عورتیں تالی بجا کر آگاہ کریں)

❁ امام غلطی سے اضافی رکعت کے لیے کھڑا ہو گیا تو مقدیوں کو تنبیہ کرنی چاہیے، امام پلٹ آئے تو صحیح ورنہ مقتدی بھی امام کی اقتدا کریں[2]، کیونکہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کو بھول کر ظہر کی پانچ رکعات پڑھادیں، جب سلام پھیرا تو لوگوں نے پوچھا: "کیا نماز زیادہ ہوگئی ہے؟" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کیا بات ہے؟" لوگوں نے کہا "آپ نے پانچ رکعات پڑھادی ہیں۔" تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سجدۂ سہو کیا۔"[3]

❁ امام غلطی سے دوسرے رکن میں منتقل ہو گیا تو مقتدیوں کو بھی امام کی اقتدا کرنی چاہیے۔ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھول کر درمیانہ تشہد بیٹھے بغیر تیسری رکعت کے لیے کھڑے ہو گئے (تو صحابہ بھی پیچھے کھڑے ہو گئے) اور آپ نے نماز مکمل کر کے سجدۂ سہو کیا۔۔۔ اور لوگوں نے بھی سجدہ کیا۔"[4]

---

[1] صحیح مسلم، حدیث: 572

[2] مسئلہ ہذا میں مقتدیوں کو امام کو تنبیہ کرنی چاہیے اور امام چاہے مکمل کھڑا ہو چکا ہو یا قراءت شروع کر چکا ہو پھر بھی اسے تشہد کی حالت میں لوٹ آنا چاہیے کیونکہ سہواً نماز میں اضافہ امر دیگر ہے اور قصداً اضافہ اور چیز ہے، دلیل مذکورہ میں بھی سہواً کا ذکر ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں کمی زیادتی کا امکان موجود ہے آپ کے بعد یہ صورت پیش نہیں آسکتی، جیسا کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے باب ماجاء فی الرجل یسلم فی الرکعتین من الظهر والعصر میں بہت عمدہ اور تفصیلی بحث کی ہے نیز امام مالک رحمہ اللہ نے مؤطا امام مالک میں بھی سہو کے مسائل کے تحت مختصر اور عمدہ بات کی ہے جو قابل مطالعہ ہے۔۔۔۔۔۔ (حافظ محمد سلیم، مفتی المدینہ اسلامک ریسرچ سینٹر کراچی)

[3] صحیح بخاری، حدیث: 1226۔ صحیح مسلم، حدیث: 91/ 572

[4] صحیح بخاری، حدیث: 1230۔ صحیح مسلم، حدیث: 86/ 570

❁ کسی غلطی پر امام سجدۂ سہو کرے تو مقتدیوں کو بھی سجدۂ سہو کرنا چاہیے۔[1]

❁ مقتدی جماعت کے دوران میں کوئی انفرادی غلطی کر لیتا ہے تو اس پر سجدۂ سہو نہیں ہوگا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''امام مقتدیوں کا ضامن ہے۔''[2]

❁ لیکن اگر مقتدی جماعت کے بعد والی رکعات میں غلطی کرے تو وہ سجدۂ سہو کرے، یا امام کے ساتھ ہی ہے، لیکن کسی وجہ سے اس کی قرأت فاتحہ رہ جائے، یا رکوع وسجدہ رہ جائے تو وہ بعد میں وہ رکعت دوبارہ پڑھے اور دو سجدے کرے۔

سجدۂ سہو کرنے کا طریقہ

❁ سجدۂ سہو نماز کے دوسرے سجدوں کی طرح کیا جاتا ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''پھر آپ نے ''اللہ اکبر'' کہا اور عام سجدوں کی طرح سجدہ کیا، یا اس سے کچھ لمبا، پھر سر اٹھاتے ہوئے ''اللہ اکبر'' کہا، پھر ''اللہ اکبر'' کہتے ہوئے سر رکھا اور عام سجدوں کی طرح، یا ان سے کچھ لمبا سجدہ کیا، پھر ''اللہ اکبر'' کہتے ہوئے سر اٹھایا۔''[3]

سجدۂ سہو کرنے کے دو مقامات ہیں

1. آخری تشہد میں دعائیں مکمل کرنے کے بعد دو سجدے کریں، پھر سلام پھیر لیں۔[4]
2. دونوں طرف سلام پھیرنے کے بعد دو سجدے کریں اور پھر سلام پھیریں۔[5]

سجدۂ سہو کے مذکورہ بالا دونوں طریقے جائز ہیں۔ دونوں رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہیں، لیکن

---

[1] (ایضاً)

[2] سنن ابی داود، حدیث: 517، ترمذی، حدیث: 207

[3] صحیح بخاری، حدیث: 1229: صحیح مسلم، حدیث: 573

[4] صحیح بخاری، حدیث: 1224: صحیح مسلم، حدیث: 1229

[5] صحیح بخاری، حدیث: 1224، صحیح مسلم، حدیث: 574

رسول اللہ ﷺ نے جس غلطی پر جو طریقہ اختیار کیا ہے، وہاں وہ طریقہ افضل ہے، یعنی رسول اللہ ﷺ نے دو رکعتیں رہ جانے پر انہیں ادا کیا اور سجدے سلام کے بعد کیے تو اس صورت میں سلام کے بعد بہتر ہیں اور ایک دفعہ آپ کا درمیانہ تشہد رہ گیا تو آپ ﷺ نے سجدے سلام پھیرنے سے پہلے کیے تو اس صورت میں پہلے افضل ہیں۔

❁ آخری تشہد میں دعائیں مکمل پڑھنے کے بعد ایک طرف سلام پھیر کر سجدۂ سہو کرنا اور پھر دوبارہ مکمل تشہد پڑھنا پھر سلام پھیرنا، یہ کسی صحیح حدیث میں موجود نہیں۔

❁ باتیں کرنے یا وقت گزرنے سے نماز دہرانی نہیں پڑے گی۔ ذوالیدین کے واقعہ میں رسول اللہ ﷺ نے باتیں کرنے اور وقت گزرنے کے باوجود نماز نہیں دہرائی، صرف باقی نماز ادا کی اور سجدۂ سہو کیا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر کچھ وقت گزر گیا، یا باتیں کر لیں تو نماز دہرانی پڑے گی، جبکہ اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے، بلکہ یہ ذوالیدین والی صحیح حدیث کے خلاف ہے۔[1]

❁ ایک نماز میں ایک سے زائد غلطیاں ہو جائیں تو ان سب کے لیے ایک ہی سجدۂ سہو کافی ہے۔

---

[1] مسئلہ مذکورہ سے نماز میں باتیں کرنے کا جواز ثابت کرنا مقصود نہیں بلکہ اس مسئلہ کی وضاحت کرنا ہے کہ اگر بھول چوک سے یا غلطی سے سلام پھرنے پر امام کو تنبیہ کرتے وقت کوئی بات ہوگئی تو اس سے نماز لوٹانی ضروری نہیں بلکہ سجدہ سہو کفایت کر جائے گا۔ البتہ ویسے نماز میں بات کرنا مطلقاً حرام ہے۔ (ادارہ)

جماعت میں شریک ہونے کا بیان

منفرد کے ساتھ نماز میں شریک ہونا

❁ تنہا آدمی نماز پڑھ رہا ہے، دوسرا شخص آئے تو وہ اس کے ساتھ مل جائے اور پہلا جماعت شروع کرادے، یعنی جماعت کے لیے پہلے سے امامت کی نیت کرنا ضروری نہیں، جیسا کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے اور میں آ کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بائیں جانب کھڑا ہو گیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے پکڑ کر دائیں جانب کر دیا۔''[1]

جماعت میں شامل ہونے کا طریقہ

❁ بعد آنے والا شخص امام کو جس حالت میں پائے، تکبیر تحریمہ کہہ کر اسی حالت پر چلا جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی شخص نماز کے لیے آئے اور امام کسی حالت میں ہو تو اسے وہی کرنا چاہیے جو امام کر رہا ہے۔''

بعض لوگ آتے ہیں، امام رکوع یا سجدہ میں ہو تو وہ جماعت میں شامل ہونے کے لیے امام کے کھڑے ہونے کا انتظار کرتے رہتے ہیں، یہ غلط ہے اور بعض لوگ پہلے دعائے استفتاح پڑھتے ہیں پھر امام والی حالت میں منتقل ہوتے ہیں، یہ بھی جائز نہیں۔ بعض لوگوں نے جماعت میں شریک ہونے کا بڑا عجیب وغریب طریقہ ایجاد کر لیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جماعت کے ساتھ بیچ میں شامل ہونے والا وہی رکعت پڑھے، جو امام پڑھ رہا ہے اور جو رکعات گزر گئی ہیں وہ بعد میں ادا کرے۔ مثلاً دوسری رکعت میں شریک

---

[1] صحیح بخاری، حدیث: 699، صحیح مسلم، حدیث: 763

ہونے والا اس ترتیب سے نماز ادا کرے:2...3...4...1 ۔تیسری رکعت میں شریک ہونے والا اس ترتیب سے نماز ادا کرے:3...4...1...2 چوتھی رکعت میں شریک ہونے والا اس ترتیب سے نماز ادا کرے:4...1...2...3۔یعنی شامل ہونے والا الٹی ترتیب سے نماز پڑھے۔[1]

قرآن وسنت میں اس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔صحیح یہ ہے کہ آپ جس رکعت میں بھی جماعت میں شریک ہوں، وہ آپ کی پہلی رکعت ہوگی،اور باقی نماز اسی ترتیب سے مکمل کریں،جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:''جتنی (رکعات جماعت سے) مل جائیں ادا کرلو اور جو رہ جائیں بعد میں پوری کرلو۔''[2]

رکوع میں ملنے والے کی رکعت

❁ رکوع کی حالت میں جماعت میں شامل ہونے سے وہ رکعت شمار نہیں ہوگی۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:''جس قدر نماز (امام کے ساتھ) پالو وہ پڑھ لو اور نماز کا جو حصہ رہ جائے وہ (امام کے سلام پھیرنے کے بعد) پورا کرو۔''[3]

اور حدیث کی رو سے جس شخص کا قیام اور سورۂ فاتحہ فوت ہوگئی،اس پر فرض ہے کہ چھوٹی ہوئی چیز کو مکمل کرے اور مکمل نہ کرنے والے کی نماز کیونکر مکمل ہوسکتی ہے؟

❁ امام بخاری رحمہ اللہ اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں:''جس کے فرائض قراءت وقیام فوت ہوجائیں اس پر لازم ہے کہ اسے مکمل کرے،جیسا کہ نبی اکرم ﷺ نے (پورا کرنے کا) حکم دیا ہے۔''[4]

---

[1] نماز باجماعت میں شامل ہونے والے کی اگر کچھ رکعات نکل چکی ہیں تو وہ جس رکعت میں شامل ہو وہ اس کی پہلی رکعت ہے یہی موقف جمہور اہل علم کا ہے جبکہ بعض اہل علم جو رکعت امام کی ہے وہی رکعت مقتدی کی شمار کرتے ہیں اس موقف کے قائلین بھی کچھ دلیل رکھتے ہیں۔ لہذا مسئلہ میں وسعت ہے۔والعلم عنداللہ (حافظ محمد سلیم مفتی المدینہ اسلامک ریسرچ سینٹر کراچی)

[2] صحیح بخاری،حدیث:636،صحیح مسلم،حدیث:602

[3] صحیح بخاری،حدیث:636،صحیح مسلم،حدیث:602

[4] صحیح بخاری،حدیث:109

❁ علامہ ابن حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جو شخص رکوع میں شامل ہو تو اس کا قیام اور سورۂ فاتحہ کی قراءت فوت ہوگئی، جبکہ (رکعت شمار کرنے کے لیے) یہ دونوں فرض ہیں، ان کے بغیر نہیں ہوتی اور حدیث رسول میں حکم دیا گیا ہے کہ جو گزر جائے اس کی قضا کی جائے اور جو رہ جائے اسے (امام کے سلام پھیرنے کے بعد) پورا کیا جائے، ان میں سے کسی امر کی تخصیص نص شرعی کے بغیر جائز نہیں (کہ فلاں رکن کے چھوٹنے کے باوجود نماز ہو جائے گی) اور ایسی کوئی دلیل موجود نہیں۔''[1]

❁ سیدنا ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

''سورۂ فاتحہ پڑھے بغیر کوئی شخص رکوع نہ کرے۔''[2]

❁ سیدنا ابو ھریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''امام کو اگر رکوع جانے سے پہلے کھڑے نہ پالو تو تمہاری وہ رکعت نہ ہوگی۔''[3]

❁ علامہ ابن حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''کوئی شخص سورۂ فاتحہ پڑھے بغیر رکعت شمار نہ کرے۔''[4]

❁ علامہ نواب صدیق الحسن خان رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی معروف کتاب ''جزء القراءة'' میں فریا ہے کہ رکوع میں ملنے سے رکعت نہیں ہوتی اور یہ ہر اس شخص کا مذہب ہے جو قراءتِ فاتحہ خلف الامام کو واجب سمجھتا ہے اور جمہور اہل علم چونکہ قرأت فاتحہ خلف الامام کے قائل ہیں، اس اعتبار سے رکوع میں ملنے کی رکعت کا نہ ہونا جمہور کا مسلک ہوا۔''[5]

❁ علامہ عبد الرحمٰن مبارک پوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''میرے نزدیک انہی کا قول راجح ہے جو کہتے ہیں کہ جو شخص امام کو رکوع میں پائے وہ اس رکعت کو شمار نہ کرے۔''[6]

---

[1] المحلی: 2/389

[2] صحیح بخاری،، حدیث: 77

[3] جزء القراءة، باب وجوب القراءة للإمام والمأموم: 20۔ اس کو علامہ البانی نے حسن کہا ہے

[4] المحلی: 2/390

[5] دليل الطالب على أرجع المطالب: 345

[6] تحفة الأحوذی: كتاب السفر، باب ماذكر فی الرجل يدرك الأمام ساجداً

حائضہ عورت کا تلاوت کرنے کا مسئلہ

دلائل کا موازنہ اور راجح مسلک

حافظ صلاح الدین یوسف [1]

ایام مخصوصہ (حیض) اور نفاس و جنابت میں عورت قرآن کریم کی تلاوت کر سکتی ہے یا نہیں؟ نیز اس حالت میں اس کا قرآن کو چھونا جائز ہے یا نہیں؟ اس مسئلے میں علماء کے درمیان اختلاف ہے۔ کوئی جواز کا قائل ہے اور کوئی عدم جواز کا۔ اس میں عدم جواز (نہ پڑھنے والا) مسلک سب سے زیادہ مشہور ہے اور دوسرے موقف پر لوگ حیرت و استعجاب کا بالعموم اظہار کرتے ہیں، اس لیے ہم اس کا قدرے تفصیل سے جائزہ لینا مناسب سمجھتے ہیں۔ اس بارے میں بالعموم درج ذیل پانچ آراء ہیں:

1. حیض کی حالت میں عورت کا قرآن پڑھنا اور اسے چھونا مطلقاً ناجائز اور ممنوع ہے۔
2. حائضہ عورت کا قرآن مجید پڑھنا اور اسے چھونا مطلقاً جائز ہے۔
3. ایک آدھ آیت کا پڑھنا جائز ہے، اس سے زیادہ نہیں۔
4. حائضہ عورت قرآن پڑھ سکتی ہے، جنبی کا قرآن پڑھنا جائز نہیں۔
5. اس کی بابت منقول کراہت، کراہتِ تحریمی نہیں، کراہت تنزیہی ہے، یعنی اس حالت میں قرآن کریم پڑھنے اور چھونے سے بچنا بہتر ہے تاہم اگر ضرورت ہو تو جنبی مرد اور حائضہ عورت کے لیے قرآن پڑھنا اور اسے چھونا جائز ہے۔

[1] مشیر وفاقی شرعی عدالت، نگران شعبہ تحقیق و تصنیف المدینہ اسلامک ریسرچ سینٹر کراچی

ہمارے نزدیک یہ آخر الذکر پانچواں مسلک راجح ہے جس کے دلائل آگے آئیں گے۔

عدم جواز کے قائلین کے دلائل

1 پہلے مسلک یعنی عدم جواز کے قائلین کی ایک دلیل تو ترمذی کی روایت ہے جس میں نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

"لَا تَقْرَأُ الْحَائِضُ وَلَا الْجُنُبُ شَيْئًا مِنْ الْقُرْآنِ۔"[1]

"حائضہ عورت اور جنبی دونوں قرآن سے کچھ نہ پڑھیں۔"

امام ترمذی رحمہ اللہ اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"صحابہ وتابعین اور مابعد کے اکثر اہل علم کا، جیسے سفیان ثوری، ابن مبارک، شافعی، احمد، اور اسحاق ہیں، قول ہے کہ حائضہ اور جنبی قرآن سے کچھ نہ پڑھیں، البتہ کوئی حرف یا آیت کا کوئی حصہ پڑھ سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں انہوں نے ان کو تسبیح وتہلیل کی اجازت دی ہے۔"

اس روایت کی سند کے بارے میں خود امام ترمذی نے یہ صراحت کی ہے:

"میں نے محمد بن اسماعیل (امام بخاری) کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ اسماعیل بن عیاش اہل حجاز اور اہل عراق سے منکر روایات بیان کرتا ہے، گویا انہوں نے اس کی ان روایتوں میں اسے ضعیف قرار دیا ہے جو اہل حجاز واہل عراق سے متفرد طور پر بیان کرتا ہے اور (امام بخاری نے) فرمایا کہ اسماعیل بن عیاش کی صرف وہ روایات قابل قبول ہیں جو وہ اہل شام سے بیان کرتا ہے۔۔۔ الخ"

اور زیر بحث روایت اسماعیل بن عیاش، موسیٰ بن عقبہ سے روایت کرتا ہے جو اہل حجاز میں سے ہیں۔ اس اعتبار سے وہ اس حدیث کی حد تک ضعیف قرار پاتا ہے۔ امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اس حدیث کے بیان کرنے میں اسماعیل بن عیاش متفرد ہے اور اہل حجاز سے اس کی روایت ضعیف ہوتی ہے جس سے حجت نہیں پکڑی جا سکتی، امام احمد اور یحییٰ بن معین وغیرہ حفاظ محدثین کا یہی قول ہے

[1] جامع الترمذی: باب الجنب والحائض أنهما لا يقرءان القرآن: حدیث: 131

اور یہ روایت اس کے علاوہ دوسرے راوی سے بھی مروی ہے اور وہ بھی ضعیف ہے۔ابن ابی حاتم کہتے ہیں: میں نے اپنے والد سے سنا اور انہوں نے اسماعیل بن عیاش کی یہ حدیث ذکر کی اور کہا کہ اس نے غلطی کی ہے، یہ دراصل ابن عمر کا قول ہے''۔[1]

اس روایت کو بعض حضرات نے اس کے کچھ متابعات کی بنیاد پر صحیح کہا ہے لیکن محدث عصر شیخ البانی رحمہ اللہ نے انہیں بھی غیر معتبر قرار دے کر اس روایت کو ضعیف ہی قرار دیا ہے۔[2]

بلکہ تعلیقات مشکاۃ میں امام احمد کے حوالے سے اسے باطل کہا ہے۔[3]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی امام طبری کے حوالے سے اس روایت کی بابت کہا ہے: ''ضعیف من جمیع طرقه'' ''جتنے بھی طرق سے یہ روایت آتی ہے، سب ضعیف ہیں''۔[4]

2 دوسری دلیل جس سے اس فریق نے استدلال کیا ہے، سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی یہ روایت ہے:

''کان صلی اللہ علیہ وسلم یقضی حاجته ثم یخرج فیقرأ القرآن ویأکل معنا اللحم ولا یحجبه، وربما قال: لایحجزه من القرآن شئ لیس الجنابة''۔[5]

''نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قضائے حاجت سے فارغ ہو کر نکلتے تو قرآن پڑھتے اور ہمارے ساتھ گوشت تناول فرماتے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قرآن پڑھنے میں سوائے جنابت کے کوئی چیز رکاوٹ نہیں بنتی تھی''۔

اس روایت کی بابت حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''اسے اصحاب السنن نے روایت کیا ہے اور ترمذی، ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے، اور بعض نے اس کے بعض راویوں کی تضعیف کی ہے اور حق بات یہ ہے کہ یہ روایت حسن کے قبیل سے ہے جو

---

[1] تحفة الاحوذی:1/ 124

[2] تفصیل کے لیے دیکھیے: ارواء الغلیل:1/ 206

[3] مشکاۃ بہ تحقیق البانی:1/ 134

[4] فتح الباری:1/ 530

[5] (رواہ الخمسة) ارواء الغلیل:2/241، رقم الحدیث:485

حجت کے قابل ہوتی ہے۔‘‘[1]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی اس رائے کی وجہ سے اکثر علماء اس روایت سے استدلال کرتے ہیں لیکن شیخ البانی رحمہ اللہ نے ابن حجر رحمہ اللہ کی اس رائے کا رد کیا ہے اور لکھا ہے:

’’اس حدیث کے بارے میں حافظ کی اس رائے سے ہم موافقت نہیں کرتے، اس لیے کہ مشارالیہ (ضعیف) راوی عبداللہ بن سلمہ ہے اور تقریب التہذیب میں خود حافظ ابن حجر نے اس کے ترجمے میں کہا ہے ’’سچا ہے لیکن اس کا حافظہ خراب ہو گیا تھا‘‘ اور یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ یہ حدیث اس کے اسی دور کی ہے جب اس کے حافظے میں خرابی پیدا ہو گئی تھی۔ پس بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ حافظ ابن حجر نے جس وقت اس حدیث پر حسن ہونے کا حکم لگایا تو اس کا ترجمہ ان کے ذہن میں مستحضر نہیں رہا، واللہ اعلم۔ یہی وجہ ہے کہ امام نووی نے المجموع (2/159) میں جب یہ حدیث نقل کی اور امام ترمذی کی تصحیح بھی ذکر کی تو انہوں نے امام ترمذی کی رائے پر تعقب کیا اور کہا: ’’امام ترمذی کے علاوہ دیگر حفاظ محققین نے کہا ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔‘‘
پھر انہوں نے امام شافعی اور امام بیہقی کی وہ رائے نقل کی ہے جو امام منذری نے ’’مختصر السنن‘‘ میں نقل کی ہے (جس میں دونوں نے اسے ضعیف کہا ہے) ان محققین نے جو کہا ہے، وہی ہمارے نزدیک راجح ہے کیوں کہ اسے بیان کرنے میں عبداللہ بن سلمہ متفرد ہے اس کی یہ روایت اس وقت کی ہے جب اس کا حافظہ متغیر ہو گیا تھا۔‘‘[2]

امام منذری کی جس عبارت کا حوالہ آیا ہے، اس کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

’’امام بخاری نے عمرو بن مرۃ کے حوالے سے کہا ہے کہ عبداللہ بن سلمہ ہمیں حدیث بیان کرتا ہے، کچھ کو ہم پہچانتے ہیں اور کچھ کو نہیں پہچانتے اور وہ سن رسیدہ ہو گیا تھا، اس کی حدیث کی متابعت نہیں کی

[1] فتح الباری: 1/530۔ طبع دار السلام، الریاض

[2] ارواء الغلیل: 2/242

جاتی اور امام شافعی نے یہ حدیث ذکر کی اور فرمایا: ''اہل حدیث (محدثین) کے نزدیک یہ حدیث پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتی۔ امام بیہقی نے کہا: امام شافعی نے اس حدیث کے ثبوت میں جو توقف کیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا مدار عبداللہ بن سلمہ کوفی پر ہے اور وہ سن رسیدہ ہو گیا اور اس کی حدیث اور عقل میں کچھ نکارت محسوس کی گئی اور اس نے یہ حدیث بھی سن رسیدگی کے بعد ہی بیان کی ہے''۔ [1]

3 تیسری حدیث جو مذکورہ حدیث کے متابع کے طور پر پیش کی جاتی ہے اور اسے علمائے معاصرین میں سے بعض نے صحیح اور بعض نے حسن کہا ہے، یہ مسند احمد (1/110) کی روایت ہے۔ اس کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

''سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے پاس وضو کا پانی لایا گیا، پس آپ نے کلی کی اور تین مرتبہ ناک میں پانی ڈالا، تین مرتبہ اپنا چہرہ دھویا اور اپنے دونوں ہاتھ اور دونوں بازو تین تین مرتبہ دھوئے، پھر اپنے سر کا مسح کیا، پھر اپنے دونوں پیر دھوئے، پھر فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اسی طرح دیکھا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وضو کیا۔ پھر قرآن کریم سے کچھ پڑھا اور فرمایا: یہ (قرآن کا پڑھنا) اس شخص کے لیے ہے جو جنبی نہیں ہے۔ رہا جنبی تو وہ ایک آیت بھی نہیں پڑھ سکتا۔'' [2]

اس روایت کو بعض علماء نے صحیح قرار دیا ہے، جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا۔ لیکن شیخ البانی رحمہ اللہ نے اس سے بھی اختلاف کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کی سند میں ابو الغریف راوی ہے جس کی توثیق ابن حبان کے سوا کسی نے نہیں کی اور ابن حبان توثیق میں متساہل ہیں، اس لیے ان کی توثیق قابل اعتبار نہیں، بالخصوص جب کہ دیگر ائمہ کی رائے ان کے معارض ہو۔ ابو حاتم راوی نے اس کی بابت کہا ہے کہ ابو الغریف مشہور نہیں۔ محدثین نے اس میں کلام کیا ہے اور یہ اصبغ بن نباتہ جیسے راویوں کا استاد ہے اور اصبغ ابو حاتم کے نزدیک لیّن الحدیث اور دوسروں کے نزدیک متروک ہے، اس قسم کے راوی کی حدیث حسن بھی نہیں ہوتی چہ جائیکہ وہ صحیح تسلیم کی جائے۔

---

[1] مختصر السنن از منذری: 1/156

[2] جامع الأصول في أحاديث الرسول: ج/1، ص/304

ثانیاً: اگر یہ روایت صحیح بھی ہو، تب بھی اس کا مرفوع ہونا صریح نہیں۔

ثانیاً: اس کا مرفوع ہونا بھی اگر صریح ہو تو یہ شاذ یا منکر ہے، اس لیے کہ عائذ بن حبیب اگرچہ ثقہ ہے لیکن ابن عدی نے اس کی بابت کہا ہے کہ اس نے کئی منکر روایات بیان کی ہیں۔

اس کے بعد شیخ البانی رحمہ اللہ نے کہا:

''میں کہتا ہوں: یہ روایت بھی شاید انہی (منکر) روایات میں سے ہو۔ اس لیے کہ اس سے زیادہ ثقہ اور اس سے زیادہ حفظ وضبط رکھنے والے راوی نے اسے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے موقوفاً بیان کیا ہے جو دارقطنی (رقم 44) میں ہے۔۔ یہ موقوف روایت حسب ذیل ہے۔ ابوالغریف ہمدانی کہتے ہیں:

''ہم سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے کہ آپ نے پیشاب یا پاخانہ کیا، پھر آپ نے پانی کا ایک برتن منگوایا، اور اپنے ہاتھ دھوئے، پھر قرآن کے آغاز سے کچھ حصہ پڑھا، پھر فرمایا: جب تک تم میں سے کسی کو جنابت نہ پہنچے تو قرآن پڑھے، پس اگر جنابت پہنچے تو ایک حرف بھی نہ پڑھے۔''

امام دارقطنی فرماتے ہیں: ''یہ روایت سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے (موقوف) صحیح سند سے ثابت ہے۔''

اس سے واضح ہوتا ہے کہ حدیث مذکور ''لا یحجبه۔۔۔۔ الخ'' کی متابع یہ روایت موقوف ہے، یعنی سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ علاوہ ازیں امام ابن خزیمہ نے کہا ہے کہ حدیث ''لا یَحْجبه۔۔۔ الخ'' (اگر صحیح بھی ہو تو) اس شخص کی دلیل نہیں بن سکتی جو جنبی کو قرآن پڑھنے سے منع کرتا ہے، اس لیے کہ اس میں ممانعت کا حکم نہیں ہے بلکہ یہ صرف حکایت فعل ہے۔''[1]

4 چوتھی روایت جس سے استدلال کیا جاتا ہے، وہ ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے گھروں کا رخ مسجد نبوی سے پھیرنے کا حکم دیا تا کہ لوگوں کا آنا جانا مسجد کے اندر سے نہ ہو بلکہ باہر سے ہو اور مسجد میں وہ صرف اسی وقت آئیں جب وہ پاک ہوں اور مسجد میں آنے کا مقصد نماز پڑھنا ہو۔ اس حکم کی وجہ آپ نے

---

[1] ارواء الغلیل: 2/ 243-244

یہ بیان فرمائی:

’’ فَإِنِّي لَا أُحِلُّ الْمَسْجِدَ لِحَائِضٍ وَلَا جُنُبٍ‘‘۔[1]

’’میں مسجد کو حائضہ عورت اور جنبی کے لیے حلال نہیں کرتا‘‘ (یعنی مسجد کے اندر سے ان کے گزرنے کو جائز نہیں سمجھتا)

شیخ البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کی سند پر بھی تفصیلی گفتگو کر کے اسے بھی نا قابل اعتبار قرار دیا ہے۔[2]

علاوہ ازیں یہ روایت قرآن کے بھی خلاف ہے۔قرآن مجید کی آیت ﴿ وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ﴾ (النساء:43) سے جنبی کا مسجد سے گزرنا جائز معلوم ہوتا ہے۔مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ آیت کی کچھ توضیح کر دی جائے۔

مذکورہ آیت کی مختصر وضاحت

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

ترجمہ:’’اے ایمان والو! جب تم نشے کی حالت میں ہو تو تم نماز کے قریب مت جاؤ، یہاں تک کہ اپنی بات سمجھنے لگو اور جنابت کی حالت میں (بھی) یہاں تک کہ غسل کر لو مگر یہ کہ راہ چلتے گزرو (اس صورت میں گزرنا جائز ہے)۔‘‘

آیت کا پہلا حکم اس وقت دیا گیا تھا جب شراب کی حرمت کا حکم نازل نہیں ہوا تھا۔بعد میں جب شراب حرام قرار دی گئی تو یہ حکم منسوخ ہو گیا۔دوسرا حکم جنبی آدمی (عورت ہو یا مرد) کے لیے ہے کہ وہ مسجد میں جنابت کی حالت میں نہ جائیں، ہاں مسجد میں سے صرف گزرنا ہو تو جائز ہے لیکن وہاں زیادہ دیر ٹھہرنا اور بیٹھنا ممنوع ہے۔اس تفسیر کی رو سے صلاۃ (نماز) سے مراد موضع الصلاۃ (نماز پڑھنے کی جگہ) یعنی مسجد ہے۔مطلب یہ ہے کہ نشے میں مدہوش شخص نماز پڑھنے کے لیے مسجد میں جائے نہ جنبی آدمی، جب تک غسل

---

[1] سنن ابی داؤد:کتاب الطهارة ،باب فی الجنب یدخل المسجد:232

[2] دیکھیے:ارواء الغلیل:210/1،حدیث نمبر:193،مشکاۃ بہ تحقیق البانی:1/ 211

نہ کرلے۔ الاّ یہ کہ مسجد اس کا راستہ ہو تو اس صورت میں وہ مسجد میں سے گزر سکتا ہے۔

امام ابن جریر طبری وغیرہ نے اسی تفسیر کو راجح قرار دیا ہے اور اس تفسیر کی رو سے جنبی کے مسجد سے گزرنے کی اجازت نکلتی ہے۔ حافظ ابن کثیر نے بھی امام ابن جریر کی اس تفسیر کو نقل کر کے لکھا ہے:

''ومن هذه الآية احتج كثير من الائمة على أنه يحرم على الجنب اللبث فی المسجد ویجوز له المرور وكذا الحائض والنفساء أيضافی معناه۔''[1]

''اس آیت سے اکثر ائمہ نے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ جنبی کا مسجد میں ٹھہرنا حرام ہے، البتہ اس کے لیے گزرنا جائز ہے، اور حائضہ اور نفاس والی عورتیں بھی اسی حکم میں ہیں۔''

دوسرے مفسرین نے ﴿وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ﴾ سے مراد مسافر لیا ہے اور مطلب یہ بیان کیا ہے کہ جنبی آدمی بھی مسجد میں نہ آئے، ہاں اگر وہ مسافر ہو اور اسے پانی نہ ملے تو وہ تیمم کر کے نماز پڑھ لے۔

امام ابن جریر طبری وغیرہ مفسرین کے نزدیک پہلی تفسیر اس لیے زیادہ صحیح ہے کہ اس آیت میں اس کے بعد ہی مسافر کے لیے پانی نہ ملنے کی صورت میں تیمم کرنے کا حکم ہے۔ اگر ﴿وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ﴾ سے مراد مسافر لیا جائے تو تکرار لازم آئے گی اس لیے ''عابري سبيل'' سے مراد صرف گزرنے والا، راستہ عبور کرنے والا ہے۔

اس طرح اس آیت سے جنبی آدمی کا مسجد سے گزرنے کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ بنابریں مذکورہ حدیث سنداً ضعیف ہونے کے علاوہ قرآن کے بھی خلاف ہے۔

❺ **پانچویں دلیل**، جس سے استدلال کیا جاتا ہے، نبی ﷺ کا وہ فرمان ہے جو آپ نے سیدنا عمرو بن حزم کے نام لکھا تھا، اس میں فرائض و سنن، دیات اور صدقات وغیرہ کی تفصیل تھی، اس میں ایک بات یہ بھی تھی:

''لا يمس القرآن الا طاهر''[2]

''قرآن کو وہی چھوئے جو پاک ہو۔''

---

[1] تفسیر ابن کثیر، زیر تحت سورۃ النساء: 46

[2] ارواء الغلیل، حدیث: 122

اس روایت کی صحت میں اگرچہ اختلاف ہے، جیسا کہ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

''اسے دار قطنی نے عمرو بن حزم، عبداللہ بن عمر اور عثمان بن ابی العاص سے مسند طور پر بیان کیا ہے لیکن ان میں ہر ایک کی سند محل نظر ہے۔''

تاہم محدثین کی اکثریت اس کی صحت کی قائل ہے۔ شیخ البانی نے بھی اسے مجموعی طرق کی بنیاد پر صحیح قرار دیا ہے۔ [1]

لیکن یہ روایت مسئلہ زیر بحث میں واضح نہیں ہے، اس لیے اسے بھی مدار استدلال نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ کیوں کہ اس میں طاہر (پاک شخص) کو قرآن مجید چھونے کی اجازت دی گئی ہے اور طاہر کا لفظ چار قسم کے افراد پر بولا جاتا ہے۔

- جو ''حدث اکبر'' (جنابت، حیض و نفاس) سے پاک ہو۔
- جو ''حدث اصغر'' سے پاک ہو (یعنی بے وضو نہ ہو)۔
- جس کے بدن پر ظاہری نجاست نہ ہو۔
- جو مومن ہو (چاہے وہ جنبی ہو یا بے وضو)۔

اس آخری مفہوم کی تائید قرآن کریم کی اس آیت سے بھی ہوتی ہے ﴿إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ﴾ ''مشرک ناپاک ہیں'' (التوبہ:28) اس کا مفہوم دوسرے لفظوں میں یہ ہوا کہ مومن پاک ہے، چاہے وہ کسی حالت میں بھی ہو، علاوہ ازیں حدیث سے بھی اس مفہوم کی تائید ہوتی ہے، چنانچہ حدیث میں ہے:

''ان المؤمن لاینجس۔'' [2]

''مومن نجس (ناپاک) نہیں ہوتا (یعنی وہ پاک ہوتا ہے)۔''

اور نبی ﷺ نے یہ بات سیدنا ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے اس وقت فرمائی تھی، جب ابوھریرہ رضی اللہ عنہ جنبی تھے۔ جس سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ مومن ہر حالت میں طاہر ہی ہوتا ہے، البتہ اس سے وہ صورتیں مستثنیٰ ہوں گی جن کی صراحت نص سے ثابت ہے، جیسے بے وضو یا اجنبی آدمی کی بابت حکم ہے کہ وہ نماز نہیں

---

[1] ارواء الغلیل، حدیث نمبر:122

[2] صحیح مسلم، رقم:371

پڑھ سکتا، جب تک وہ وضو یا غسل نہ کرلے۔لیکن اس کے علاوہ دیگر کاموں کے لیے وہ پاک ہی متصور ہوگا۔

ان کی مزید تائید ان احکام سے ہوتی ہے جو حائضہ عورتوں کی بابت دیئے گئے ہیں، جیسے خاوند اس کے ساتھ لیٹ سکتا اور (شرم گاہ کے علاوہ) مباشرت کرسکتا ہے، اس کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا جائز ہے، اس کی گود میں لیٹے ہوئے قرآن پڑھ سکتا ہے۔ جیسا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ عمل بیان فرمایا ہے۔ بلکہ ایک موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسجد میں ہوتے ہوئے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا، جب کہ وہ ایام مخصوصہ میں تھیں: ''مجھے کپڑا (چادر) پکڑا دو' سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا۔''إنی حائض'' ''میں تو مخصوص ایام (حیض کی حالت) میں ہوں'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''ان حَیْضَتَکِ لَیْسَتْ بِیَدِکِ''[1]

''تیرا حیض تیرے ہاتھوں میں نہیں ہے۔''

اس تفصیل سے یہ واضح ہے کہ طاہر کے چاروں معنوں میں سے یہ آخری معنی دوسرے دلائل کی رو سے زیادہ صحیح ہے، جبکہ دوسرے معنی اتنے قوی نہیں ہیں اور اس آخری معنی کی رو سے جنبی یا حائضہ کا قرآن پڑھنا یا اسے چھونا ممنوع ثابت نہیں ہوتا کیونکہ جنبی اور حائضہ بھی مومن ہونے کی وجہ سے پاک ہیں۔

عدم مس (نہ چھونا) علیحدہ مسئلہ اور عدم قراءت (نہ پڑھنا) علیحدہ مسئلہ ہے

بعض حضرات نے کہا ہے کہ اس بات پر اجماع ہے کہ محدث حدثِ اکبر (یعنی جنبی اور حائضہ) کے لیے قرآن کریم کا چھونا جائز نہیں ہے، اس لیے طاہر کے معنی، حدث اکبر سے پاک شخص، متعین ہیں اور یوں یہ حدیث اس مسئلے میں نص صریح کی حیثیت رکھتی ہے۔لیکن اجماع کا دعویٰ ہی صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ امام بخاری، امام ابن جریر طبری، امام داؤد ظاہری، امام ابن حزم، امام ابن المنذر، شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ اور امام ابن القیم رحمہم اللہ وغیرہم جنبی اور حائضہ کو قرآن کریم پڑھنے کی اجازت دیتے ہیں۔ (ان کے دلائل آگے بیان ہوں گے) جب یہ بات ہے تو پھر دعوائے اجماع کیوں کر صحیح ہے؟

[1] ارواء الغلیل: 1/ 212، رقم الحدیث: 194

6 **چھٹی دلیل**، جس سے استدلال کیا جاتا ہے، قرآن کریم کی یہ آیت ﴿لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ﴾ ہے، جس کا ترجمہ ہے، ''پاک لوگ ہی اسے چھوتے ہیں۔'' (الواقعہ:79) لیکن یہ خبر ہے، حکم نہیں ہے، کیونکہ یہ نفی کا صیغہ ہے، نہی کا نہیں ہے۔ اگر یہ نہی کا صیغہ ہوتا تو لا یمَسَّهُ (سین کے زبر سے) ہوتا، پھر اس کا ترجمہ حکم کا ہوتا یعنی ''اسے پاک لوگ ہی چھوئیں'' اس صورت میں اس سے عدم قراءت اور عدم مس قرآن پر استدلال ہوسکتا تھا۔

لیکن جب ایسا نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ اس میں یہ خبر دے رہا ہے کہ لوح محفوظ کو یا قرآن کریم کو صرف فرشتے ہی چھوتے ہیں، یعنی آسمانوں پر فرشتوں کے علاوہ کسی کی بھی اس قرآن یا لوح محفوظ تک رسائی نہیں ہے۔ ''لا یمَسُّهُ'' میں ضمیر کا مرجع بعض نے لوح محفوظ کو اور بعض نے قرآن کو بنایا ہے۔ مطلب دونوں صورتوں میں مشرکین کی تردید ہے جو کہتے تھے کہ قرآن، شیاطین لے کر اترتے ہیں۔ اللہ نے یہ فرمایا کہ یہ کیوں کر ممکن ہے، یہ قرآن تو شیطانی اثرات سے بالکل محفوظ ہے کیوں کہ ایک تو وہ لوح محفوظ میں ہے جس تک کسی کی رسائی نہیں ہے۔ ثانیاً: پاک فرشتے ہی اسے چھوتے ہیں، فرشتوں کے علاوہ کوئی اور وہاں پہنچ ہی نہیں سکتا۔ ثالثاً: فرشتے (روح الامین) ہی اسے لے کر زمین پر اترتے ہیں۔

اس اعتبار سے آیت کا تعلق مسئلہ زیر بحث سے کہ طاہر شخص کے سوا اسے کوئی چھوسکتا ہے یا نہیں؟ ہے ہی نہیں۔ علاوہ ازیں یہ سورت مکی ہے اور مکی سورتوں میں احکام و مسائل کا زیادہ بیان نہیں ہے۔ بلکہ ان میں توحید و رسالت اور آخرت کے اثبات پر زور دیا گیا ہے، البتہ فحوائے آیت سے استدلال کرتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ حدثِ اصغر، اکبر سے پاک ہوکر قرآن کی تلاوت کرنا افضل ہے تو اس کی افضلیت میں یقیناً کوئی کلام نہیں (جیسا کہ آگے اس کی تفصیل آئے گی)۔

بعض اردو مفسرین کی آراء

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مسئلہ زیر بحث اور آیت کے سلسلے میں عصر حاضر کے بعض اردو مفسرین کی آراء بھی ذکر کر دی جائیں۔

❋ مولانا مودودی صاحب آیت مذکور سے ممانعت کا مفہوم لینے والوں کا رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ تفسیر آیت کے سیاق و سباق سے مطابقت نہیں رکھتی۔ سیاق و سباق سے الگ کر کے تو اس کے الفاظ کا یہ مطلب نکالا جا سکتا ہے، مگر جس سلسلۂ کلام میں وارد ہوئی ہے اس میں رکھ کر اسے دیکھا جائے تو یہ کہنے کا سرے سے کوئی موقع نظر نہیں آتا کہ ''اس کتاب کو پاک لوگوں کے سوا کوئی نہ چھوئے'' کیوں کہ یہاں تو کفار مخاطب ہیں اور ان کو یہ بتایا جا رہا ہے کہ یہ اللہ رب العالمین کی نازل کردہ کتاب ہے، اس کے بارے میں تمہارا یہ گمان قطعی غلط ہے کہ اسے شیاطین نبی پر القا کرتے ہیں۔ اس جگہ یہ شرعی حکم بیان کرنے کا آخر کیا موقع ہو سکتا تھا کہ کوئی شخص طہارت کے بغیر اس کو ہاتھ نہ لگائے؟ زیادہ سے زیادہ جو بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اگرچہ آیت یہ حکم دینے کے لیے نازل نہیں ہوئی مگر فحوائے کلام اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کتاب کو صرف مطہّرین ہی چھو سکتے ہیں، اسی طرح دنیا میں بھی کم از کم وہ لوگ جو اس کے کلام الٰہی ہونے پر ایمان رکھتے ہیں، اسے ناپاکی کی حالت میں چھونے سے اجتناب کریں۔''

مختلف مسالک کی آراء

مولانا مودودی مرحوم اس بارے میں مختلف مسالک کا ذکر کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں:

❋ **مسلک حنفی:** رہا قرآن پڑھنا، تو وہ وضو کے بغیر جائز ہے۔ (بدائع الصنائع) بچے اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔ تعلیم کے لیے قرآن بچوں کے ہاتھ میں دیا جا سکتا ہے خواہ وہ وضو سے ہوں یا بے وضو۔ (فتاویٰ عالمگیری)

❋ **مذہب مالکی:** مصحف کو ہاتھ لگانے کے لیے وضو شرط ہے۔ لیکن قرآن کی تعلیم کے لیے وہ استاد شاگرد

دونوں کو اس سے مستثنیٰ کرتے ہیں۔ بلکہ حائضہ عورت کے لیے بھی وہ بغرض تعلیم مصحف کو ہاتھ لگانا جائز قرار دیتے ہیں۔ابن قدامہ نے المغنی میں امام مالک کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ جنابت کی حالت میں تو قرآن پڑھنا ممنوع ہے مگر حیض کی حالت میں عورت کو قرآن پڑھنے کی اجازت ہے کیونکہ ایک طویل مدت تک اگر ہم اسے قرآن پڑھنے سے روکیں گے تو وہ بھول جائے گی۔

ظاہر یہ کا مسلک یہ ہے کہ قرآن پڑھنا اور اس کو ہاتھ لگانا ہر حال میں جائز ہے خواہ آدمی بے وضو ہو یا جنابت کی حالت میں ہو، یا عورت حیض کی حالت میں ہو۔ابن حزم نے المحلی (جلد اول، صفحہ:77 تا84) میں اس مسئلے پر مفصل بحث کی ہے جس میں انہوں نے اس مسلک کی صحت کے دلائل دیے ہیں اور یہ بتایا ہے کہ فقہاء نے قرآن پڑھنے اور اس کو ہاتھ لگانے کے لیے جو شرائط بیان کی ہیں، ان میں سے کوئی بھی قرآن وسنت سے ثابت نہیں ہے۔ [1]

❁ مفتی محمد شفیع صاحب طہارت کو ضروری قرار دینے کے باوجود لکھتے ہیں:

’’مگر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث جو بخاری ومسلم میں ہے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی حدیث جو مسند احمد میں ہے، اس سے بغیر وضو تلاوت قرآن فرمانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہے، اس لیے فقہاء نے بلا وضو تلاوت کی اجازت دی ہے۔‘‘ (تفسیر مظہری) [2]

محدث عصر شیخ محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ کا موقف پہلے بیان ہو چکا ہے کہ مُحدِث (بے وضو) جنبی اور حائضہ کے قرآن پڑھنے سے ممانعت کی کوئی حدیث صحیح نہیں ہے۔ [3]

تفسیر ثنائی: اس آیت کی بنا پر بعض اہل علم بغیر وضو کے قرآن پاک کو چھونا جائز نہیں جانتے مگر اکثر محققین یہاں مراد لیتے ہیں کہ قرآن پاک سے وہی لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں جو پاک باطن ہیں۔ [4]

---

[1] تفہیم القرآن:5/ 295

[2] تفسیر معارف القرآن:8/ 287-288

[3] حاشیہ ’’ریاض الصالحین‘‘ بہ تحقیق شیخ البانی، باب245، ص495، طبع بیروت

[4] قرآن مجید، ثنائی ترجمہ، ص:643

جواز کے قائلین کے دلائل

مذکورہ تفصیل سے واضح ہے کہ پہلی رائے ،یعنی عدم جواز کے قائلین کے پاس کوئی مضبوط دلیل نہیں ہے۔اس کے برعکس دوسرا موقف یہ ہے کہ جنبی اور حائضہ کا قرآن پڑھنا اور چھونا جائز ہے۔ان مجوزین میں امام طبری اور امام بخاری جیسے حضرات اور دیگر کئی جلیل القدر ائمہ شامل ہیں،**ان کے دلائل حسب ذیل ہیں:**

1 ممانعت کی تمام روایات ضعیف ہیں،اس لیے وہ قابل احتجاج نہیں،اگر کوئی صحیح ہے تو وہ محتمل المعانی ہے،اس لیے اس سے بھی استدلال صحیح نہیں (جیسا کہ پہلے تفصیل گزر چکی ہے)اور جب روایات میں ضعف شدید ہو تو مجموعۂ روایات بھی قابل استدلال نہیں ہوتا۔

بنابریں اس رائے میں بھی کوئی وزن نہیں کہ یہ سب روایات ایک دوسرے کو تقویت پہنچاتی ہیں، شیخ البانی مسجد میں جنبی اور حائضہ کے داخلے کی ممانعت والی حدیث کی تضعیف کے بعد لکھتے ہیں:

”للحديث بعض الشواهد،لكن بأسانيد واهية لاتقوم بها حجة، ولا يأخذ الحديث بها قوة“۔[1]

”اس حدیث کے بعض شواہد ہیں لیکن ان کی سندیں نہایت کمزور ہیں جن سے نہ حجت قائم ہوتی ہے اور نہ حدیث کو کوئی قوت حاصل ہوتی ہے۔“

اسی طرح حدیث”لا يقرأ الجنب ولا الحائض شيئا من القرآن“ کے ضعف پر بحث کرتے اور اس کے ایک راوی کو بعض حضرات کے ثقہ کہنے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”فقد اتفقت كلمات هؤلاء الأئمة على تضعيف ابن مسلمة هذا، فلو سلمنا بأن الدار قطنى أراده بقوله”هو ثقة“،لو جب عدم الاعتداد به لما تقرر فى المصطلح أن الجرح مقدم على التعديل لا سيما إذا كان مقروناً ببيان السبب كما هو الواقع هنا“۔[2]

---

[1] ارواء الغلیل:1 / 211،رقم الحدیث:193

[2] ارواء الغلیل:1 / 109،رقم الحدیث:192

''تمام ائمہ کے اقوال اس ابن مسلمہ کی تضعیف پر متفق ہیں اور اگر ہم تسلیم کر لیں کہ دارقطنی کے قول ''وہ ثقہ ہے'' سے مراد یہ ابن مسلمہ ہی ہے تب بھی ضروری ہے کہ اسے کوئی اہمیت نہ دی جائے کیونکہ مصطلحات حدیث میں یہ اصول طے ہے کہ جرح، تعدیل پر مقدم ہے، بالخصوص جب کہ جرح مفصل ہو، یعنی اس کے ساتھ اس جرح کی وجہ بھی بیان ہو، جیسا کہ یہاں ہے۔''

2 صحیح روایات کے عموم سے ہر حالت میں قرآن کریم کے پڑھنے کا جواز ثابت ہوتا ہے، جیسے حدیث میں ہے:

''کان النبی ﷺ یذکر اللہ علی کل احیانہ۔''[1]

''نبی ﷺ ہر حالت میں اللہ کا ذکر کرتے تھے۔''

اس حدیث سے ان کا استدلال یہ ہے کہ ذکر کا لفظ عام ہے جس میں قرآن بھی شامل ہے کیوں کہ قرآن کو بھی ذکر کہا گیا ہے:

﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾ (الحجر:9)

''ہم نے ہی اس ذکر (قرآن) کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔''

گویا ان کے نزدیک اس حدیث کے عموم سے جنابت سمیت ہر حال میں قرآن کا پڑھنا جائز ثابت ہوا، شیخ البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث (ہر حال میں اللہ کا ذکر کرتے تھے) سے استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے:

''محدث (بے وضو)، جنبی اور حائضہ کے لیے قرآن پڑھنے سے ممانعت کی کوئی حدیث صحیح نہیں ہے بلکہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا مروی حدیث سے اس کا جواز ثابت ہوتا ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہر حالت میں اللہ کا ذکر کرتے تھے۔''[2]

---

[1] صحیح البخاری، فی ترجمة الباب، کتاب الحیض، باب:8

[2] ریاض الصالحین (حاشیہ) بہ تحقیق شیخ البانی، ص:495، طبع بیروت

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''اسی لیے امام بخاری اور ان کے علاوہ ان ائمہ نے جو جواز کے قائل ہیں جیسے: طبری، ابن منذر اور امام داود، ان سب نے ''کان یذکر اللّٰہ۔۔۔۔ الخ'' کے عموم سے دلیل پکڑی ہے، اس لیے کہ ذکر کا لفظ عام ہے اس میں قرآن اور غیر قرآن دونوں آجاتے ہیں۔ ذکر اور تلاوت میں جو فرق کیا جاتا ہے اس کی بنیاد صرف عرف ہے۔''

3 اس حدیث سے بھی استدلال کیا گیا ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے، جب وہ ایام حج میں حائضہ ہوگئی تھیں۔ فرمایا تھا:

''فافعلی ما یفعل الحاج غیر أن لاتطوا فی بالبیت حتی تطھری۔''[1]

''تم پاک ہونے تک بیت اللہ کے طواف کے سوا وہ سب کچھ کرو جو حاجی کرتے ہیں۔''

اس حدیث سے اس طرح استدلال کیا گیا ہے کہ اعمال حج، ذکر، تلبیہ، تلاوت قرآن اور دعا پر مشتمل ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں بیت اللہ کے طواف کے سوا کسی چیز سے منع نہیں کیا، صرف طواف کو مستثنیٰ کیا اور جب حائضہ کے لیے قرآن پڑھنا جائز ہوا تو جنبی کے لیے بطریق اولیٰ جائز ہوگا کہ عورت کا حدث مرد کے حدث سے زیادہ غلیظ ہے۔

4 امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے اسی واقعے کو بنیاد بنا کر باب باندھا ہے:

''باب :تقضی الحائض المناسک کلھا إلا الطواف بالبیت۔''

''حائضہ عورت حج کے تمام مناسک پورا کرے سوائے بیت اللہ کے طواف کے۔''

اس باب میں امام بخاری رحمہ اللہ نے مذکورہ دونوں احادیث کے علاوہ بعض صحابہ وتابعین کے اقوال بھی ذکر کیے ہیں، چنانچہ اس باب کے تحت امام موصوف نے جو اقوال و دلائل نقل کیے ہیں، ان کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

---

[1] صحیح البخاری: رقم:205

’’ابراہیم (نخعی) نے کہا: حائضہ عورت اگر ایک آیت پڑھ لے تو کوئی حرج نہیں۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے جنبی کے قرآن پڑھنے میں کوئی حرج نہیں دیکھا اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر حالت میں اللہ کا ذکر کرتے تھے۔ سیدہ ام عطیہ نے کہا: ہمیں حکم دیا جاتا تھا کہ حائضہ عورتیں نکل کر (عید گاہوں میں) جائیں، پس وہ مردوں کی تکبیروں کے ساتھ تکبیر کہیں اور دعا میں شریک ہوں، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: مجھے سیدنا ابو سفیان نے خبر دی کہ ہرقل (بادشاہ روم) نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خط منگوایا اور اسے پڑھا، اس میں تھا: بسم اللہ الرحمن الرحیم ﴿ يٰأَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ ﴾ (اس کے بعد وہی سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے ایام حج میں حائضہ ہونے کا اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کا ذکر ہے)۔‘‘

امام بخاری کے طرز استدلال کو اس طرح واضح کیا گیا ہے، ذیل میں ہم اس کا ترجمہ پیش کرتے ہیں:

’’امام بخاری کا مطلب اس باب سے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے واقعہ سے حائضہ اور جنبی کے قرآن پڑھنے کے جواز پر استدلال کرنا ہے، اس لیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حج کے تمام مناسک میں سے طواف کے سوا کسی چیز کو مستثنیٰ نہیں کیا۔۔۔۔۔ اور حج کے اعمال ذکر، تلبیہ اور دعا پر مشتمل ہیں اور حائضہ کو ان میں سے کسی چیز سے نہیں روکا گیا، پس اسی طرح جنبی کا معاملہ ہے، اس لیے کہ عورت کا حدث مرد کے حدث سے زیادہ ناپاک ہے۔ (جب حائضہ عورت قرآن پڑھ سکتی ہے تو جنبی تو بطریق اولیٰ پڑھ سکتا ہے) اور امام بخاری کے نزدیک اسی ضمن میں وارد احادیث میں سے کوئی حدیث صحیح نہیں ہے، اگرچہ اس کی بابت وارد احادیث دوسروں کے نزدیک باہم مل کر قابل احتجاج بن جاتی ہیں۔ لیکن ان میں اکثر احادیث قابل تاویل ہیں۔‘‘[1]

5 حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے بھی ’’اعلام الموقعین‘‘ میں اس مسئلے پر گفتگو کی ہے۔ ایک تو انہوں نے بھی منع قراءت کی روایت کو ضعیف اور ناقابل اعتبار قرار دیا ہے۔ ثانیاً: قراءت قرآن کے جواز کے موقف کو اس طرح واضح کیا ہے:

---

[1] فتح الباری: 1/529

’’اللہ تعالیٰ نے حائضہ عورت کے بارے میں احکام کو دو قسموں میں تقسیم فرمایا ہے۔ احکام کی ایک قسم تو وہ ہے جس کا ازالہ حالت حیض کے بعد حالت طہر میں آسانی سے ممکن ہے تو ایسے احکام حالت حیض میں اس کے لیے ضروری قرار نہیں دیے بلکہ اس سے ساقط کر دیے ہیں (سقوط کی دو صورتیں ہیں) یا تو مطلقاً ساقط کر دیے ہیں، جیسے نماز ہے، حالت حیض میں نماز بالکل معاف کر دی۔ یا حالت طہر میں ان احکام کی قضاء (ادائیگی) کا حکم دیا، جیسے روزے ہیں، حیض میں تو روزہ رکھنے سے منع کر دیا لیکن بعد میں اس کمی کو پورا کرنے کا حکم دیا۔

اور احکام کی دوسری قسم وہ ہے جس کا بدل بھی ممکن نہیں اور حالت طہر تک اس کا مؤخر کرنا بھی مناسب نہیں سمجھا تو اس کی مشروعیت کو حیض کے باوجود برقرار رکھا، جیسے احرام باندھنا، عرفات میں وقوف کرنا، طواف کے علاوہ دیگر مناسک حج کا ادا کرنا ہے، اسی طرح اس کے لیے حالت حیض میں قراءت قرآن کا جائز ہونا ہے اس لیے کہ حالتِ طہر میں اس کا ازالہ بھی ممکن نہیں ہے کیونکہ حیض کی مدت لمبی ہوتی ہے، اس مدت میں قرآن کی تلاوت سے روکنے میں کئی نقصان ہیں، جیسے حفظ قرآن میں خلل وغیرہ۔‘‘[1]

6 امام بن حزم رحمہ اللہ نے بھی جواز کے مسلک کی پرزور تائید کی ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

’’قرآن مجید کا پڑھنا اور اس کی آیت سجدہ پر سجدہ کرنا، قرآن مجید کا چھونا اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا، یہ سارے کام جائز ہیں، چاہے وضو ہو یا نہ ہو اور چاہے جنبی ہو یا حائضہ۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ مذکورہ سارے کام افعال خیر ہیں جو مستحب ہیں اور ان کا کرنے والا اجر کا مستحق ہے، جو شخص اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ مذکورہ کام بعض حالتوں میں منع ہیں تو اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کی دلیل پیش کرے۔‘‘

اس کے بعد امام ابن حزم نے ان تمام دلائل کا جائزہ لیا جو مانعین کی طرف سے پیش کیے جاتے

---

[1] تفصیل کے لے دیکھیے: اعلام الموقعین :3/28، طبع 1979ء بہ تحقیق عبدالرحمان الوکیل

ہیں۔اس اعتبار سے ان کے نزدیک بھی منع کی کوئی صحیح دلیل نہیں ہے۔(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو:المحلی ،مسئلہ نمبر:116)

7 شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''جنبی اور حائضہ کا قرآن پڑھنا،اس کے بارے میں علماء کے دوقول ہیں:ایک رائے ہے کہ دونوں کے لیے جائز ہے اور یہ امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے اور امام شافعی اور امام احمد کا بھی مشہور قول یہی ہے۔دوسری رائے ہے کہ جنبی کے لیے جائز نہیں ہے اور حائضہ کے لیے جائز ہے۔اس کے لیے تو مطلقاً(یعنی ہر وقت) جائز ہے یا اس وقت جب اسے بھولنے کا خوف ہو اور یہ امام مالک کا مذہب ہے اور امام احمد وغیرہ کا مذہب ایک قول کے مطابق یہی ہے،اس لیے حائضہ عورت کے قرآن پڑھنے کی بابت نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی چیز ثابت نہیں،سوائے اس حدیث کے جو اسماعیل بن عیاش سے موسیٰ بن عقبہ عن نافع عن ابن عمر کی سند سے مروی ہے کہ ''حائضہ اور جنبی قرآن سے کچھ نہ پڑھے''۔اسے ابوداؤد وغیرہ نے روایت کیا ہے اور یہ حدیث،حدیث کی معرفت رکھنے والوں کے نزدیک بالاتفاق ضعیف ہے اور اسماعیل بن عیاش اہل حجاز سے جو روایت کرتا ہے،وہ سب احادیث ضعیف ہیں،بخلاف ان روایات کے جو اہل شام سے بیان کرتا ہے اور یہ روایت ثقہ راویوں میں سے کوئی بھی نافع سے روایت نہیں کرتا اور یہ معلوم ہے کہ عورتیں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں حائضہ ہوتی تھیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو قراءت قرآن سے منع نہیں کیا جیسے آپ نے انہیں ذکر و دعا سے منع نہیں کیا۔بلکہ حائضہ عورتوں کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ وہ عید کے دن گھروں سے نکلیں اور مسلمانوں کی تکبیرات کے ساتھ وہ بھی تکبیرات پڑھیں اور (اسی طرح) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حائضہ کو حکم دیا کہ وہ بیت اللہ کے طواف کے علاوہ حج کے سارے مناسک ادا کرے،وہ حالت حیض میں ہوتے ہوئے تلبیہ کہے،اسی طرح مزدلفہ اور منیٰ اور ان کے علاوہ دیگر مشاعر میں (حج کے افعال) سرانجام دے۔ اس کے برعکس نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنبی کو حکم نہیں دیا کہ وہ عید میں حاضر ہو اور یہ کہ وہ نماز پڑھے،نہ اسے

حج کے مناسک ادا کرنے کا کہا، اس لیے کہ جنبی آدمی کے لیے یہ ممکن ہے فوری طور پر پاک ہوجائے، پس اس کے پاس ناپاک رہنے کے لیے کوئی عذر نہیں ہے۔ بہ خلاف حائضہ عورت کے کہ اس کی ناپاکی باقی رہنے والی ہے، اس لیے اس کی موجودگی میں پاکیزگی حاصل کرنا ممکن ہی نہیں۔ اس لیے علماء نے یہ کہا ہے کہ کہ وہ پاک ہوئے بغیر عرفہ یا مزدلفہ اور منیٰ میں وقوف کرے، اگرچہ وقوف کے لیے طہارت شرط نہیں ہے لیکن مقصود یہ ہے کہ شارع نے حائضہ کو تو بطور وجوب یا بطور استحباب اللہ کا ذکر اور اس سے دعا کرنے کا حکم دیا ہے اور جنبی کے لیے ان چیزوں کو مکروہ جانا ہے۔

اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ حائضہ کو جو رخصتیں دی گئی ہیں وہ جنبی آدمی کو نہیں دی گئیں اور اس کی وجہ صرف (وہ قدرتی) عذر ہے (جو عورت کو حاصل ہے) اگرچہ اس کا حدث زیادہ غلیظ ہے اسی طرح قرآن پڑھنے کا مسئلہ ہے، شارع نے حائضہ عورت کو اس سے منع نہیں کیا ہے۔ اگر کہا جائے کہ شارع نے جنبی کو منع کیا ہے (تو اس کی وجہ یہ ہے کہ) کہ جنبی کے لیے تو یہ ممکن ہے کہ وہ پاک ہوجائے اور قرآن پڑھ لے، بخلاف حائضہ عورت کے کہ وہ کئی دن تک اسی حالت پر قائم رہتی ہے، پس وہ (اتنے دنوں تک، اگر قرآن اس کے لیے پڑھنا ممنوع ہو) قرآن پڑھنے سے محروم رہے گی اور اس کے لیے ایسی عبادت سے محرومی ہے جس کی وہ ضرورت مند ہے اور وہ طہارت بھی حاصل کرنے سے عاجز ہے اور قراءت قرآن نماز کی طرح نہیں ہے، اس لیے کہ نماز کے لیے تو شرط ہے کہ حدث اکبر (جنابت وحیض) اور حدث اصغر (عدم وضو) سے پاک ہو۔ اور قرآن کا پڑھنا حدث اصغر (عدم وضو) کے ساتھ جائز ہے۔ یہ نص سے بھی ثابت ہے اور اس پر ائمہ کا اتفاق بھی ہے۔

علاوہ ازیں نماز کے لیے استقبال قبلہ، لباس اور نجاست سے پاکیزگی بھی ضروری ہے، جبکہ قراءت قرآن کے لیے ان میں سے کوئی چیز بھی ضروری نہیں، بلکہ نبی ﷺ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی گود میں اپنا

سر مبارک رکھ دیا کرتے تھے، جب کہ وہ حائضہ ہوتی تھیں اور یہ بات صحیح حدیث میں بیان ہوئی ہے۔ نیز صحیح مسلم میں ہے، اللہ تعالیٰ نبی ﷺ سے فرماتا ہے:

"اني منزل عليك كتابا لايغسله الماء، تقرأه نائماً ويقظاناً۔"[1]

"میں تجھ پر ایسی کتاب نازل کر رہا ہوں جسے پانی نہیں مٹا سکتا، تو اسے سوتے جاگتے پڑھ سکتا ہے۔"

اس دوسرے مسلک کی رو سے، جس کی تفصیل گزشتہ صفحات میں گزری، جنبی اور حائضہ کا قرآن پڑھنا مطلقاً جائز ہے اور اس کی بنیاد دو باتوں پر ہے:

- اول یہ کہ ممانعت کی تمام احادیث ضعیف ہیں، وہ قابل حجت نہیں۔
- دوم یہ کہ صحیح احادیث کے عموم سے جواز کا اثبات ہوتا ہے۔

تیسرا مسلک

تیسرا مسلک یہ ہے کہ ایک آدھ آیت پڑھی جا سکتی ہے۔

لیکن ظاہر بات ہے کہ یہ رائے معقولیت پر مبنی نہیں۔ اگر ممانعت کی دلیل موجود ہے تو پھر ایک آیت کے بھی پڑھنے کا جواز کس طرح نکل سکتا ہے؟ اگر ممانعت کی کوئی واضح دلیل نہیں تو پھر ایک آدھ آیت ہی پڑھنے کی اجازت کیوں؟ پھر جتنا کوئی پڑھنا چاہے کیوں نہیں پڑھ سکتا؟ علاوہ ازیں آیات لمبی بھی ہیں اور چھوٹی بھی، لمبی آیت کی صورت میں صفحہ ڈیڑھ صفحہ پڑھا جا سکتا ہے۔ اس صورت میں کیا قرآن کا اکرام واحترام متاثر نہیں ہوگا۔

چوتھا مسلک

اسی طرح یہ مسلک بھی کمزور ہے کہ حائضہ قرآن پڑھ سکتی ہے لیکن جنبی نہیں پڑھ سکتا، اس کی دلیل ان کے نزدیک یہ ہے کہ حیض کی مدت طویل ہے، اتنے عرصے تک قرآن نہ پڑھنے میں زیادہ نقصان ہے، جبکہ

[1] مجموع الفتاویٰ: 21/ 459-462

جنابت کی مدت نہایت قلیل ہے۔ حافظ ابن حزم اس مسلک کی بابت اور اس کی غیر معقولیت کو واضح کرتے ہیں:

"اگر قراءت قرآن حائضہ کے لیے حرام ہے تو اس کی مدت حیض کی طوالت قراءت قرآن کو اس کے لیے حلال نہیں کر سکتی اور اگر اس کے لیے قرآن پڑھنا جائز ہے تو طول مدت سے استدلال کرنا کوئی معنیٰ نہیں رکھتا۔"[1]

پانچواں اور راجح مسلک

پانچویں رائے اس مسئلے میں یہ ہے کہ حیض وجنابت کی حالت میں قرآن پڑھنا کراہت تحریمی نہیں، کراہت تنزیہی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ان حالتوں میں قرآن پڑھنے اور چھونے سے اجتناب بہتر ہے۔ تاہم پڑھ اور چھولیا جائے تو جائز ہے۔ یہ رائے دو لحاظ سے راجح ہے۔

اولاً: جمہور علماء جو مطلقاً ممانعت کے قائل ہیں، ان کے پاس اپنے موقف کے اثبات کے لیے کوئی صحیح حدیث اور واضح نص نہیں ہے۔ جن احادیث سے استدلال کیا گیا ہے وہ سب ضعیف ہیں اور ایک آدھ حدیث جو صحیح ہے، محتمل المعنیٰ ہے، اس لیے وہ بھی نص صریح یا دلیل قاطع نہیں بن سکتی۔ اسی طرح امام بخاری، امام ابن حزم اور دیگر ائمہ، جو مطلقاً جواز کے قائل ہیں، ان کے پاس بھی کوئی واضح دلیل نہیں ہے، ان کا استدلال صرف عمومی الفاظ پر مبنی ہے، اس لیے اس سے مطلقاً جواز کا مفہوم محل نظر ہے۔ کیونکہ عموم کے باوجود حدیث میں ملتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قضائے حاجت سے فراغت کے بعد جب تک وضو نہیں کر لیا، سلام کا جواب دینا پسند نہیں فرمایا۔[2]

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ "یذکر اللہ علی کل احیانہ" کے عموم کے باوجود نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعض حالتوں میں محتاط رویہ اختیار کیا ہے، اس سے یقیناً کراہت تنزیہی کا اثبات ہوتا ہے، کیوں کہ کراہت، جواز کے منافی نہیں، چنانچہ شیخ البانی رحمہ اللہ ابوداؤد کی مذکورہ حدیث کے حوالے سے تحریر کرتے ہیں:

---

[1] المحلی: 1/104۔ ط 1967۔ مکتبہ الجمهوریہ العربیة، مصر

[2] سنن ابی داوٗد، حدیث نمبر: 17

''پیشاب سے فراغت کے بعد نبی ﷺ کا سلام کرنے والے کو یہ جواب دینا کہ ''میں اس بات کو ناپسند کرتا ہوں کہ بغیر طہارت کے اللہ کا ذکر کروں''۔ یہ اس بات کی صریح دلیل ہے کہ جنبی کے لیے قراءت قرآن مکروہ ہے، اس لیے کہ حدیث میں یہ بات سلام کا جواب دینے کے ضمن میں آئی ہے جیسا کہ ابوداؤد وغیرہ میں صحیح سند سے مروی ہے۔ پس قرآن تو سلام سے اولیٰ ہے جیسا کہ ظاہر ہے اور کراہت جواز کے منافی نہیں جیسا کہ معروف ہے، اس لیے اس حدیث صحیح کی وجہ سے کراہت والی رائے کا اختیار کرنا ضروری ہے اور اگر اللہ نے چاہا تو یہ سب اقوال میں سے سب سے زیادہ انصاف پر مبنی رائے ہے۔''

آج کل ہر جگہ مدرسۃ البنات (بچیوں کے تعلیمی مدارس) عام ہو گئے ہیں، حفظ قرآن کے بھی دینی علوم کی تدریس کے بھی، مطلقاً ممانعت اور عدم جواز کے فتویٰ پر عمل سے ان مدارس میں پڑھنے والی طالبات اور پڑھانے والی استانیوں کو جو مشکلات پیش آسکتی ہیں وہ محتاج وضاحت نہیں۔ یہ فقہی اصطلاح میں گویا عموم بلویٰ کی صورت پیدا ہو گئی ہے جس میں فقہاء جواز کا فتویٰ دیتے ہیں۔

شیخ محمد بن صالح العثیمین رحمہ اللہ کی رائے

غالباً اسی لیے عصر حاضر کے بعض ان کبار علماء نے بھی، جو عدم جواز کے قائل ہیں، مدارس دینیہ میں زیر تعلیم طالبات اور ان میں پڑھانے والی استانیوں کے لیے جواز کا فتویٰ دیا ہے، چنانچہ شیخ محمد بن صالح العثیمین رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

''اس مسئلے میں علماء کا اختلاف جاننے کے بعد یہی بات زیادہ شایان شان ہے کہ یہ کہا جائے حائضہ کے لیے ہمیشہ یہی ہے کہ وہ قرآن کریم زبان سے نہ پڑھے، سوائے ضرورت وحاجت کے۔ جیسے کوئی استانی (معلم) ہے، اس کے لیے طالبات کو پڑھانا اس کی ضرورت ہے یا امتحان کے موقع پر خود

طالبات کو بھی امتحان دینے کے لیے قرآن کریم کا پڑھنا ایک ضرورت ہے یا اور اس قسم کی کوئی ضرورت ہو تو حائضہ کے لیے قرآن کریم کا پڑھنا جائز ہے۔"[1]

بنا بریں یہ حالات اور ضروریات اس بات کی متقاضی ہیں کہ جواز کے فتویٰ کو تسلیم کیا جائے، بالخصوص جب کہ دلائل کے عموم سے اس کی تائید ہوتی ہے نہ کہ تردید، علاوہ ازیں جب کہ ممانعت کے دلائل صحت و استناد کے اعتبار سے محل نظر ہیں، اس لیے زیادہ سے زیادہ یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ حائضہ اور جنبی اگر اجتناب کر سکیں تو بہتر ہے، بہ صورت دیگر جواز سے مفر نہیں، واللہ اعلم بالصواب۔

قرآن مجید کو چھونے (ہاتھ لگانے اور ہاتھ سے پکڑنے) کا حکم

گزشتہ دلائل سے واضح ہے کہ مومن ہر وقت پاک ہے حتیٰ کہ جنابت کی حالت میں بھی وہ پاک ہی ہوتا ہے۔ بنا بریں اس کے لیے ہر کام جائز ہے جس کی ممانعت نہیں آئی ہے۔ مثلاً نماز کی بابت وضاحت ہے کہ وہ عدم وضو یا حالت جنابت میں نماز نہیں پڑھ سکتا تو نماز پڑھنا اس کے لیے یقیناً ممنوع ہے جب تک وہ وضو یا غسل نہ کر لے لیکن قرآن مجید وہ پڑھ سکتا ہے کیونکہ اس کی ممانعت کی بابت کوئی صریح اور صحیح حدیث ثابت نہیں۔ اسی طرح قرآن مجید کا چھونا یعنی اسے ہاتھ لگانا اور ہاتھ سے پکڑنا بھی جائز ہے، اس کے لیے وضو یا غسل ضروری نہیں جیسا کہ اکثر علماء غسل کو (جنبی اور حائضہ) کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں۔ اس کی دلیل وہ قرآن کی یہ آیت پیش کرتے ہیں:

﴿لَّا يَمَسُّهُۥٓ إِلَّا ٱلْمُطَهَّرُونَ﴾ (الواقعہ:79)

"اسے پاک لوگ ہی چھو سکتے ہیں۔"

یعنی آسمانوں پر لوح محفوظ میں صرف فرشتے ہی اسے چھوتے ہیں اور وہاں سے نقل کرتے ہیں۔ اس میں شیطان یا اس کے چیلے چانٹوں کا کوئی عمل دخل نہیں ہے، جیسا کہ پہلے اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔

---

[1] مجموع فتاویٰ ورسائل شیخ محمد بن صالح العثیمین: 11/ 311

بنابریں اس سے یہ استدلال صحیح نہیں کہ جنبی یا حائضہ قرآن مجید کو نہیں چھو سکتے، اس لیے کہ مومن اس حالت میں بھی پاک ہی ہوتا ہے، اسی طرح حدیث:

"لایمس القرآن إلا طاهر"[1]

"قرآن پاک کو پاک شخص ہی چھوئے۔"

بہ شرط صحت یہ مطلوبہ مفہوم میں واضح نہیں، اس لیے کہ مومن پاک ہی ہوتا ہے، حدیث، میں ہے:

"ان المؤمن لا ینجس۔"[2]

"مومن ناپاک نہیں ہوتا۔"

﴿إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ﴾ (التوبۃ:28)

"صرف مشرک ہی نجس ہیں۔"

اسی لیے نبی ﷺ نے دشمن (مشرکوں) کی سرزمین پر قرآن ساتھ لے کر جانے سے منع فرمایا ہے تاکہ وہ ان کے ناپاک ہاتھوں سے محفوظ رہے۔ بہرحال اس امر کی بھی واضح دلیل اور نص نہیں کہ جنبی یا حائضہ قرآن کو نہیں چھو سکتے۔

حافظ ابن حزم رحمہ اللہ نے "المحلی" میں اس پر تفصیلی بحث کی ہے اور مصحف کو چھونے کا اثبات کیا ہے، اسے ملاحظہ فرمالیا جائے۔

❁ جب حائضہ کے لیے قرآن کریم کی تلاوت جائز ہے تو دیگر اوراد و وظائف اور اذکار وغیرہ پڑھنا، احادیث و تفاسیر اور دیگر دینی کتب و رسائل کا مطالعہ کرنا بطریق اولیٰ جائز ہوگا۔

❁ حائضہ عورت مسجد میں داخل ہو سکتی ہے یا نہیں؟ اس کی بابت علماء کے پانچ قول ہیں، اکثر علماء عدم جواز کے قائل ہیں اور بعض علماء جواز کے۔

---

[1] المؤطا۔ باب الوضوء من مس الذکر، ج/1، ص/58

[2] صحیح مسلم: رقم 371

قائلین جواز کے دلائل حسب ذیل ہیں:

1 مومن پاک ہی ہوتا ہے، ناپاک نہیں۔ جب ایسا ہے تو اسے مسجد میں داخل ہونے سے کس طرح روکا جاسکتا ہے؟

2 اہل صفہ اور اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، رضی اللہ عنہم مسجد میں سوبھی جاتے تھے اور نیند کی حالت میں احتلام کا خطرہ رہتا ہے، اس کے باوجود نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کو مسجد میں سونے سے منع نہیں فرمایا، جس سے جنبی وغیرہ کا مسجد میں دخول کا جواز ثابت ہوتا ہے۔

3 ازواج مطہرات مسجد نبوی میں ہی اعتکاف بیٹھا کرتی تھیں، وہاں ان کے حائضہ ہونے کا امکان رہتا تھا، اس کے باوجود نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو منع نہیں فرمایا۔

4 ممانعت کی حدیث:

''فأني لاأحل المسجد لحائض ولاجنب''۔[1]

''میں حائضہ اور جنبی کے مسجد میں داخلے کو جائز قرار نہیں دیتا''

سنداً ضعیف ہے (شیخ البانی رحمہ اللہ) جیسا کہ پہلے بھی تفصیل گزری۔ اس لیے اس سے استدلال نہیں کیا جاسکتا۔

5 نماز عید کے اجتماع میں عورتوں کی شرکت کی جس حدیث میں تاکید کی گئی ہے، اس میں ہے:

''ويعتزل الحيض المصلیٰ''[2]

''حائضہ عورتیں مصلیٰ سے الگ رہیں''۔

ان علماء کے نزدیک یہاں ''مصلیٰ'' سے مراد مسجد (جائے نماز) نہیں بلکہ نماز ہے، اس کی دلیل یہ ہے

---

[1] سنن ابی داؤد، رقم: 232

[2] صحیح البخاری: رقم: 324

کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نماز عید مسجد میں نہیں بلکہ کھلی فضاء میں ہوتی تھی، اس لیے مصلیٰ کو جائے نماز (مسجد) سمجھنا صحیح نہیں، اسی طرح قرآن کی آیت:

﴿وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ﴾ (النساء:43)

میں جنبی کو صرف گزرنے کی اجازت دی گئی ہے ٹھہرنے کی نہیں۔ لیکن یہ حکم جنبی کے لیے ہے، حائضہ کو جنبی پر قیاس نہیں کیا جاسکتا، اس لیے کہ جنبی فوری طور پر پاک ہوسکتا ہے لیکن حائضہ کا پاک ہونا اس کے اختیار میں نہیں ہے۔

حائضہ عورت کے لیے طواف قدوم، طوافِ افاضہ اور طوافِ وداع کا حکم

1 طوافِ قدوم:

جو خاتون حج کی تیاری کر چکی ہو لیکن اس کے حیض کے ایام شروع ہوجائیں تو اس کی دو صورتیں ہیں۔ اگر وہ آٹھ ذوالحجہ سے، جب کہ حج کے ارکان شروع ہوتے ہیں، آٹھ دس دن پہلے مکہ مکرمہ پہنچ جائے تو وہ جاتے ہی اپنے محرم کے ساتھ طواف قدوم (اور سعی) نہ کرے بلکہ پاک ہونے کا انتظار کرے۔ اور پاک ہونے کے بعد سات ذوالحجہ تک طواف اور سعی اور تقصیر (بال کاٹنے کا کام) کرلے۔ یہ اس کا عمرہ ہوگیا اور اس کا حج، حج تمتع ہوگیا۔ دوسرا طواف، طواف افاضہ، اور سعی اور تقصیر 10 ذالحجہ کو کرے گی۔ دوسری صورت یہ ہے کہ حائضہ عورت حج کے قریب مکہ پہنچے تو اس حالت میں چونکہ وہ طواف (طوافِ قدوم) نہیں کرسکتی۔ تو وہ حج تمتع کے بجائے حج، قِران کی نیت کرلے اور احرام کی حالت میں رہے اور آٹھ ذوالحجہ سے اپنے محرم کے ساتھ حج کے تمام ارکان ادا کرلے، اس حالت میں حج کے دیگر سارے ارکان وہ ادا کرسکتی ہے۔ 10 ذولحجہ کو اگر وہ پاک ہوچکی ہو تو طواف افاضہ اور سعی اور تقصیر کرے۔ اس کے بعد وہ احرام کی پابندیوں سے آزاد ہوجائے گی اور اس کا حج بھی مکمل ہے۔ تاہم یہ حج قِران ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا تھا، ان کا حج بھی حج قِران تھا۔ حج قِران ہو یا حج تمتع، دونوں کے لیے قربانی ضروری ہے۔ تاہم حج تمتع

میں عمرے کے بعد احرام کی پابندیاں ختم ہوجاتی ہیں اور آٹھ ذولحجہ سے دوبارہ شروع ہوجاتی ہیں اور حج قِران میں احرام کی پابندی طواف افاضہ تک برقرار رہتی ہے۔

(2) طواف افاضہ

یہ دس ذوالحجہ (یوم النحر) کو ہوتا ہے، اسے طواف زیارت بھی کہتے ہیں، یہ حج کا ایک رکن ہے جس کے بغیر حج نہیں ہوتا۔ لیکن اگر عورت 10 ذوالحجہ تک پاک نہ ہو تو وہ کیا کرے؟ یہ طواف نہایت ضروری ہے لیکن حیض اس کے کرنے میں مانع ہے۔

جب سفر حجاز کے لیے آنے جانے کی یہ پابندیاں نہیں تھیں جواب ہیں کہ واپسی کی تاریخیں مقرر ہوتی ہیں اور تنہا عورت اپنے قافلے اور گروپ سے علیحدہ بھی نہیں ہوسکتی، جب ایسی صورت نہیں تھی تو اہل قافلہ رک جایا کرتے تھے اور جب عورت پاک ہوجاتی تو وہ طواف افاضہ کرلیتی تھی اور پھر قافلہ واپسی کے لیے روانہ ہوجاتا۔ اب صورت حال یکسر بدل گئی ہے، اب واپسی میں کسی کا اختیار نہیں ہے اور ایک دن کی تاریخ بھی بالعموم ممکن نہیں۔ اب عورت کیا کرے گی؟

فقہائے کرام نے اس کے مختلف حل تجویز کیے ہیں لیکن سب میں مشکلات ہیں، جبکہ عورت کا یہ عذر ایسا ہے جو اس کے اختیار میں نہیں ہے اور شریعت نے غیر اختیاری عذر میں سہولتیں دی ہیں، صاحبِ عذر کو مشکل میں نہیں ڈالا ہے، جیسے مریض کو اس کی بیماری کی نوعیت کے اعتبار سے سہولتیں دی ہیں، حتیٰ کہ مضطر اور لاچار کو جان بچانے کے لیے مردار تک کھانے کی اجازت دی گئی ہے اور اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اعلان بھی فرمایا ہے:

﴿ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ ﴾ (الحج:78)

''اور اللہ نے تم پر دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی۔''

﴿ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ﴾ (البقرہ:286)

''اللہ تعالیٰ کسی جان کو اس کی طاقت سے زیادہ مکلّف (ذمے دار) نہیں بناتا۔''

﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ (البقرہ:185)
''اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے اور تمہارے ساتھ تنگی نہیں چاہتا۔''

وغيرها من الآيات

جب اللہ تعالیٰ صاحب عذر کو آسانی مہیا فرماتا ہے تو حائضہ عورت کو جس کا عذر بھی طبعی اور غیر اختیاری ہے، کس طرح مشکل میں ڈالنا جائز ہوگا، اس لیے شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ اور ان کے تلمیذ رشید حافظ ابن القیم رحمہم اللہ دونوں نے اس مسئلے پر بڑی تفصیل سے بحثیں کی ہیں اور فقہاء کے تجویز کردہ تمام حلوں کو مزاج شریعت کے خلاف قرار دیا ہے اور خود اس کا یہ حل تجویز کیا ہے کہ حائضہ عورت، مستحاضہ عورت کی طرح، اچھی طرح لنگوٹ وغیرہ کس لے اور اسی حالت میں طواف افاضہ کر لے اور اس پر کوئی دم وغیرہ بھی نہیں ہے۔ [1]

سعودی علماء کا فتویٰ

عصرِ حاضر کے سعودی علماء نے بھی امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے یہی فتویٰ دیا ہے کہ حائضہ عورت (سفر کی موجودہ حالات کی وجہ سے) لنگوٹ باندھ کر طواف افاضہ کر لے کیونکہ اس کے لیے قافلے سے الگ ہو کر پاک ہونے تک مکہ میں ٹھہرنا بھی نہایت مشکل ہے اور اپنے ملک جا کر آئندہ سال دوبارہ حج کے لیے آنا بھی یا اپنے ملک میں جا کر طواف افاضہ کے انتظار تک حالت احرام میں رہنا بھی نہایت مشکل ہے۔ [2]

(3) طوافِ وداع

یہ طواف اس وقت کرنے کا حکم ہے جب حاجی مکے سے روانہ ہونے لگے، یہ بالکل آخری وقت میں کرے اور اس کے فوراً بعد مکے سے نکل جائے، مکے میں نہ ٹھہرے۔ اسی لیے جو مکے ہی کے مستقل

---

(1) تفصیل کے لیے ملاحظہ: مجموع الفتاویٰ: 26/176-241۔

(2) ملاحظہ ہو: فتاویٰ ارکان اسلام، للشیخ عثیمین رحمہ اللہ، صفحہ: 428-429، فتاویٰ اسلامیہ (مجموعہ علمائے سعودی عرب) ج/2، ص/317-318۔ مطبوعہ دار السلام

باشندے ہیں، ان کے لیے یہ طواف ضروری نہیں ہے، یہ صرف ان حجاج کرام کے لیے ہے جو دیگر علاقوں سے صرف حج کے لیے آتے ہیں اور مکے میں ان کا قیام عارضی ہوتا ہے۔لیکن اگر کوئی عورت طوافِ افاضہ کے بعد حائضہ ہوجائے اور تاریخِ روانگی تک وہ پاک نہ ہوتو وہ کیا کرے؟ اس کے لیے حکم یہ ہے کہ اس کے دوسرے ہم سفر یہ طواف کرلیں اور یہ خود یہ طوافِ وداع نہ کرے۔ رسول اللہ ﷺ کے حجۃ الوداع میں ام المومنین سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ یہ معاملہ پیش آیا، عین کوچ والی رات کو ان کے ایام شروع ہو گئے، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ سے اس کا تذکرہ کیا تو آپ نے فرمایا:

''اَحَا بِسَتُنَاهِي''

''کیا وہ ہماری واپسی میں رکاوٹ بنے گی؟''

آپ کو بتلایا گیا کہ انہوں نے طواف افاضہ کرلیا ہے اور اس کے بعد ایام شروع ہوئے ہیں تو آپ نے فرمایا:

''فَلاَ اِذًا''[1]

''تب کوئی حرج والی بات نہیں۔''

اس سے معلوم ہوا کہ طواف وداع کے بغیر حائضہ عورت کا مکہ چھوڑ دینا جائز ہے، ایسی حالت میں اس کے لیے رخصت ہے، اس کا حج مکمل ہے، طوافِ وداع کے لیے اس کا ٹھہرنا ضروری نہیں۔

مانع حیض گولیوں کا استعمال

آج کل حیض کی عارضی بندش کے لیے گولیاں مل جاتی ہیں، ڈاکٹر کے مشورے سے ان کے استعمال کو علماء نے جائز قرار دیا ہے، اس لیے اگر ان کے استعمال سے حیض کے آنے کا خطرہ نہ رہے تو پھر پورے سفر حج میں وہ مشکلات پیدا نہ ہوں جو حیض کی وجہ سے طواف قدوم اور طوافِ زیارت کے موقع پر ہوتی ہیں۔ یہ گولیاں حیض کی عارضی بندش کے لیے استعمال کی جا سکتی ہیں اگر کوئی کرنا چاہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

---

[1] صحیح البخاری، کتاب الحج، باب اذا حاضت المرأۃ بعد ما افاضت، حدث 1757 و 1771

سرکاری اور پرائیویٹ ملازمین وافسران

کیلئے امانت ودیانت کے حوالے سے چند ضروری نصیحتیں

تالیف: عبدالمحسن العباد حفظہ اللہ[1]

ترجمہ وتلخیص خالد حسین گورایہ

تمہید از مترجم

شیخ عبدالمحسن عباد حفظہ اللہ مدینہ منورہ کے علماء میں سے ایک جلیل القدر عالم دین ہیں، اور اس وقت محدّثِ مدینہ کا درجہ رکھتے ہیں۔ مسجد نبوی میں درس حدیث کیلئے آپ کی خصوصی مسند لگائی جاتی ہے اور کئی دہائیوں سے آپ مدینۃ الرسول اور مسجد الرسول میں قال اللہ وقال الرسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صدا بلند کر رہے ہیں۔ شیخ حفظہ اللہ کی متعدد تصنیفات مختلف موضوعات پر شائع ہوچکی ہیں۔ ان تصنیفات میں ان کا ایک کتابچہ ملازمین وافسران کے لئے امانت ودیانت کی اہمیت اس کی ادائیگی کا طریقہ کار کے حوالے سے پند ونصائح پر مشتمل ہے۔ جس سے ملازم پیشہ سے وابستہ طبقہ مستفید ہوسکتا ہے تاکہ یہ چیز ان کے اخلاص اور نیتوں کی اصلاح کا باعث بنے

[1] محدث مدینہ منورہ، مدرس مدینہ یونیورسٹی، مدینہ منورہ

اور وہ اپنا فریضہ مزید امانت ودیانت سے ادا کرنے میں کامیاب ہوں۔ اور ان میں اپنی ذمہ داریوں کو کماحقہ ادا کرنے کی مزید محنت ولگن پیدا ہو۔

اسی قصد کو سامنے رکھتے ہوئے اور کتابچہ کی اہمیت وافادیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسے اختصار کے ساتھ اردو قالب میں ڈھالا ہے اللہ تعالیٰ سے امید کرتے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ اس سے تمام مسلمانوں کو مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

امانت کی ادائیگی کے حوالے سے قرآنی ہدایات

امانت کی اہمیت اور خیانت کو ترک کرنے سے متعلق فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَى أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ إِنَّ اللَّهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهِ إِنَّ اللَّهَ كَانَ سَمِيعًا بَصِيرًا﴾ (النساء:58)

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ تمہیں تاکیدی حکم دیتا ہے کہ امانت والوں کی امانتیں انہیں پہنچاؤ اور جب لوگوں کا فیصلہ کرو تو عدل اور انصاف سے فیصلہ کرو یقیناً وہ بہتر چیز ہے جس کی نصیحت تمہیں اللہ تعالیٰ کر رہا ہے، بیشک اللہ تعالیٰ سنتا ہے دیکھتا ہے۔''

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ مذکورہ آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: ''اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ وہ امانتوں کو ان کے اہل لوگوں کے سپرد کرنے کا حکم دیتا ہے اور ایک حدیث میں ہے جو حسن عن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جو امانت تمہارے سپرد کرے اس کی امانت ادا کرو اور جو تمہارے ساتھ خیانت کرے تم اس کے ساتھ خیانت نہ کرو۔''[1]

ان نصوص میں وہ تمام امانتیں آجاتی ہیں جو انسان پر واجب اور لازم ہوتی ہیں ان میں اللہ تعالیٰ کے اپنے بندوں پر حقوق جیسے نماز زکوٰۃ، روزہ، کفارات، نذر وغیرہ شامل ہیں۔ اور حقوق العباد بھی اس امانت

[1] سنن ابی داؤد، باب فی الرجل یأخذحقه من تحت یده، حدیث:3536

کے زمرے میں آجاتے ہیں جس میں بعض بندوں کے بعض دیگر پر حقوق لازم آتے ہیں۔ جیسے وہ گروی وغیرہ جس پر بغیر کسی دلیل کے کسی کو امین بنایا جاتا ہے۔ان تمام قسم کی امانتوں کی اللہ تعالیٰ نے حفاظت کرنے اور انہیں ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔ پس جو شخص انہیں دنیا میں ادا نہیں کرے گا قیامت کے دن اس سے اس کی وصولی کی جائے گی۔''

اور فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَخُونُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ وَتَخُونُوا أَمَانَاتِكُمْ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾

ترجمہ:''اے ایمان والو! تم اللہ اور رسول (کے حقوق) میں جانتے ہوئے خیانت مت کرو اور اپنی قابل حفاظت چیزوں میں خیانت مت کرو۔'' (الأنفال:27)

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں''خیانت میں تمام چھوٹے بڑے لازم ومتعدی گناہ شامل ہیں، علی بن ابی طلحہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں:''وَتَخُونُوا أَمَانَاتِكُمْ'' امانت سے مراد وہ تمام کام ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے بندے کو امین بنایا ہوتا ہے،یعنی فرائض وواجبات۔فرمایا''خیانت نہ کرو،یعنی ان سے بدعہدی نہ کرو۔ایک روایت میں ہے:''لَا تَخُونُوا اللهِ وَالرَّسُول'' فرماتے ہیں:''اس کی سنت چھوڑ کر اور نافرمانی کر کے منع کردہ امور کا ارتکاب کر کے (خیانت نہ کرو)۔''

فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا ﴾ (الأحزاب:72)

ترجمہ''ہم نے اپنی امانت کو آسمانوں اور زمین پر پہاڑوں پر پیش کیا لیکن سب نے اس کے اٹھانے سے انکار کردیا اور اس سے ڈر گئے (مگر) انسان نے اٹھالیا وہ بڑا ہی ظالم جاہل ہے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان مبارک ہے''منافق کی تین نشانیاں ہیں: جب بات کرتا ہے جھوٹ بولتا ہے،

اور جب وعدہ کرتا ہے خلاف ورزی کرتا ہے، اور جب اسے امین بنایا جاتا ہے تو خیانت کرتا ہے۔''[1]

اور ایک روایت میں ہے ''جب بات کرتا ہے جھوٹ بولتا ہے، اور جب وعدہ کرتا ہے تو خلاف ورزی کرتا ہے، اور جب جھگڑتا ہے تو گالی دیتا ہے''۔[2]

امانت کی اہمیت وضرورت کے حوالے سے نبی کریم ﷺ سے وارد احادیث

سیدنا ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: (ایک دن) رسول کریم (ﷺ) صحابہ کرام سے (کسی سلسلہ میں) باتیں کررہے تھے کہ اچانک ایک دیہاتی (مجلس نبوی میں) آیا اور کہنے لگا کہ قیامت کب آئے گی؟ نبی کریم (ﷺ) نے فرمایا کہ جب امانت، ضائع کی جانے لگے تو قیامت کا انتظار کرنا''۔ دیہاتی نے پوچھا کہ امانت، کیونکر ضائع کی جائے گی اور یہ نوبت کب آئے گی؟ آپ (ﷺ) نے فرمایا۔''جب حکومت وسلطنت (اور دیگر کاموں) کی زمامِ کار نااہل لوگوں کے سپرد ہوجائے تو (سمجھنا کہ یہ امانت کا ضائع ہوجانا ہے اور اس وقت) قیامت کا انتظار کرنا۔''[3]

سیدنا ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:''جس شخص نے تمہیں امین بنایا ہے اس کی امانت اس تک پہنچادو اور جو شخص تمہارے ساتھ خیانت کرے تم اس کے ساتھ خیانت نہ کرو۔''[4]

سیدنا انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:''تم اپنے دین کی جو سب سے پہلی چیز کھوؤ گے وہ امانت ہے، اور آخری چیز نماز ہے۔''[5]

---

[1] صحیح البخاری، باب علامة المنافق ،حدیث:33

[2] سنن ابی داؤد، باب الدلیل علی زیادة الأیمان ونقصانه، حدیث:4690

[3] صحیح البخاری، باب من رفع صوته بالعلم، حدیث:59

[4] سنن ابی داؤد، باب فی الرجل یأخذحقه من تحت یده، حدیث:3536

[5] رواه الخرائطی فی مکارم الأخلاق، ص/28۔السلسلة االصحیحة للألبانی:1739

کوئی بھی ورکر اگر اپنا کام محنت اور اخلاص سے کرے گا تو اسے دنیا اور آخرت دونوں جہاں میں اس کا صلہ ملے گا

دنیا میں اس طرح کہ محنت اور لگن سے کام کرنے کے عوض اسے اس کا حلال معاوضہ دیا جائے گا اور آخرت میں اللہ تعالیٰ نے اس کیلئے ثواب جزیل تیار کر رکھا ہے۔ کیونکہ ایسی متعدد شرعی نصوص وارد ہوئی ہیں جن میں یہ بیان ہوا ہے کہ جو انسان بھی اللہ تعالیٰ سے ثواب کی امید اور اس کی خوشنودی کی امید رکھتے ہوئے اپنا سرانجام دیتا ہے تو اسے اس پر ثواب ملتا ہے۔

صحیح بخاری ومسلم میں ابی مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جب کوئی شخص اپنے اہل (وعیال) پر ثواب سمجھ کر خرچ کرے، تو وہ اس کے حق میں (صدقہ) کا حکم رکھتا ہے۔''[1]

اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو فرمایا: ''تم اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے جو کچھ خرچ کروگے (قلیل یا کثیر) تمہیں اس کا ثواب ضرور دیا جائے گا، یہاں تک کہ جو (لقمہ) تم اپنی بیوی کے منہ میں رکھو (اس کا بھی ثواب ملے گا)۔''[2]

ان نصوص سے واضح ہوا کہ مسلمان اگر اپنے اوپر عائد ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوگا تو دنیا میں وہ اپنی ذمہ داری سے بریٔ الذمہ ہوگیا اور اگر اس نے وہ کام اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کیلئے کیا ہوگا تو آخرت میں اسے اجر وثواب سے بھی نوازا جائے گا۔

کام کیلئے مخصوص کئے گئے وقت کو صرف اور صرف اسی کام کیلئے ہی خاص رکھنا چاہئے

ہر ملازم اور افسر پر واجب ہے کہ وہ کام کیلئے مخصوص کئے گئے وقت میں وہی کام سرانجام دے جس کی اسے ذمہ داری دی گئی ہے۔ لہٰذا کام کے اوقات میں معینہ کام کے علاوہ کسی اور کام میں خود کو مصروف نہ

---

[1] صحیح البخاری، باب ماجاء أن الأعمال بالنية، حديث:55

[2] صحیح البخاری، باب قول النبی ﷺ، باب ماجاء أن الأعمال بالنية، حديث:56

رکھے نہ اس کیلئے یہ روا ہے کہ وہ اس وقت میں سے اپنے ذاتی کاموں کیلئے وقت نکالے، یا پھر کسی اور کے کاموں کیلئے جن کا اس کی ذمہ داری سے کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ ڈیوٹی کیلئے مخصوص کیا گیا وقت ملازم اور افسر کی ملکیت نہیں ہے۔ بلکہ یہ وہ امانت ہے جس کا وہ معاوضہ وصول کررہا ہے۔

شیخ معمر بن علی البغدادی رحمہ اللہ نے وزیر نظام الملک کو ایک بلیغ اور مفید نصیحت کرتے ہوئے فرمایا: ''اے صدر الاسلام آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ عام لوگ تو قاصد اور وافد (یعنی آنے جانے والوں) کے معاملے میں خود مختار ہوتے ہیں جس سے چاہتے ہیں مل لیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں نہیں ملتے ،لیکن جس شخص کے ہاتھ میں زمامِ حکم اور امر ولایت ہے وہ قاصد اور وافد (آنے جانے والے ضرورت مندوں) کے معاملے میں خود مختار نہیں ہے، کیونکہ جو مخلوق پر امیر ہے وہ حقیقت میں ان کا خادم اور ملازم ہے، اس نے اپنا وقت ان کیلئے بیچ کر اس کی قیمت وصول کر لی ہے، لہٰذا اس کے دن کا کوئی حصہ بھی اس کے اختیار میں نہیں ہے کہ جس میں وہ اپنی مرضی سے تصرف کر سکے، اور اس کیلئے یہ روا بھی نہیں ہے کہ وہ نوافل پڑھتا رہے یا اعتکاف میں بیٹھ جائے۔۔۔ کیونکہ یہ سب نوافل ہیں اور یہ جو ذمہ داری اس کو سونپی گئی ہے وہ فرض ہے''۔ اور ایک دفعہ نصیحت کرتے ہوئے اسے یہ فرمایا: ''اپنی قبر کو بھی ایسے ہی تعمیر کرو جیسے آپ نے اپنے محل کو تعمیر کیا ہے'' (یعنی قبر کیلئے بھی اسی اہتمام سے تیاری کرو جس اہتمام سے تم نے اپنا محل تعمیر کروایا ہے)۔[1]

لہٰذا جب انسان اپنے لیے یہ پسند کرتا ہے کہ میری محنت کی مجھے مزدوری مکمل ملے اس میں کسی قسم کی کمی بیشی اور کٹوتی نہ کی جائے اسی طرح اس پر بھی لازم ہے کہ کام کیلئے مختص کردہ وقت میں بھی وہ کوئی کمی بیشی اور کٹوتی نہ کرے۔ ایسا نہ ہو کہ کام کے وقت وہ اور (ذاتی) ذمہ داریاں ادا کرتا رہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی مذمت کی ہے جو ناپ تول میں کمی کرتے ہیں اور جب لیتے ہیں تو پورا پورا چاہتے ہیں اور جب دیتے ہیں تو اس میں ڈنڈی مارتے ہیں اور دوسروں کا حق مارتے ہیں چنانچہ فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ الَّذِينَ إِذَا اكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ وَإِذَا كَالُوهُمْ أَوْ وَزَنُوهُمْ يُخْسِرُونَ أَلَا

[1] ذیل طبقات الحنابلة لابن رجب (1/107)

يَظُنُّ أُولَٰئِكَ أَنَّهُم مَّبْعُوثُونَ لِيَوْمٍ عَظِيمٍ يَوْمَ يَقُومُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ ﴾ (المطففین:1-6)

ترجمہ: ''بڑی خرابی ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کی۔ کہ جب لوگوں سے ناپ کر لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں۔ اور جب انہیں ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو کم دیتے ہیں کیا انہیں مرنے کے بعد اٹھنے کا خیال نہیں اس عظیم دن کے لئے۔ جس دن سب لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے۔''

ملازم اور افسر کو منتخب کرنے کا معیار (کیا ہونا چاہئے)؟

ہر ملازم اور افسر میں بنیادی طور پر ضروری ہے کہ وہ طاقت ور اور امانت دار ہو، کیونکہ قوت کے ذریعے وہ اپنے مطلوبہ کام کو کما حقہ سرانجام دے پائے گا، اور امانت کے ذریعے وہ اس کام کو اس دل جمعی اور خلوص سے سرانجام دے گا جس سے اس کی ذمہ داری پوری ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے واقعے میں انہی دو امور کا تذکرہ فرمایا ہے کہ جب صاحب مدین کی ایک بیٹی نے اپنے والد سے یہ کہا کہ: ﴿ يَا أَبَتِ اسْتَأْجِرْهُ إِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِينُ ﴾ (القصص:26)

ترجمہ: ''ان دونوں میں سے ایک نے کہا کہ ابا جی! آپ انھیں مزدوری پر رکھ لیجئے، کیونکہ جنہیں آپ اجرت پر رکھیں ان میں سے سب سے بہتر وہ ہے جو مضبوط اور امانتدار ہو۔''

اور یوسف علیہ السلام سے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ انہوں نے بادشاہ سے یہ کہا ﴿ اجْعَلْنِي عَلَىٰ خَزَائِنِ الْأَرْضِ إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ ﴾ (یوسف:55)

ترجمہ: ''(یوسف علیہ السلام) نے کہا آپ مجھے ملک کے خزانوں پر معمور کر دیجئے میں حفاظت کرنے والا اور باخبر ہوں۔''

قوت اور امانت کی ضد عاجزی کمزوری اور خیانت ہے۔ یہ دو چیزیں کسی بھی ملازم کو مسترد کرنے اور اس کو اس کے عہدے سے فارغ کرنے کی وجوہات میں سے بنیادی وجہیں ہیں۔

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے جب سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو کوفہ کا امیر منتخب کیا، تو کوفہ کے چند

بے وقوف افراد نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ان کی شکایت لگائی تو عمر رضی اللہ عنہ نے مصلحت اس میں جانی کہ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو معزول کر دیا جائے تاکہ فتنہ کا سدباب ہو جائے اور یہ اوباش اور بے وقوف کہیں ان کو نقصان نہ پہنچائیں۔لیکن عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی مرضِ وفات میں جن چھے صحابہ کو کو چنا تھا کہ ان میں سے خلیفہ منتخب کرلیا جائے ، ان میں سعد بن ابی وقاص بھی تھے۔اس موقع پر عمر رضی اللہ عنہ نے محسوس کیا کہ کہیں لوگ یہ نہ سمجھ لیں کہ میں نے انہیں کوفہ سے اس لئے معزول کیا تھا کہ ان میں اہلیت اور صلاحیت نہیں تھی اس لیے انہوں نے اس چیز کو محسوس کرتے ہوئے واضح کیا کہ ان کی معزولی عدم اہلیت کی بنا پر نہیں تھی چنانچہ فرمانے لگے:''اگر امارت کیلئے سعد کو منتخب کرلیا جائے تو یہ ٹھیک ہی ہوگا،اور اگر ایسا نہ ہوا تو تم میں سے جو بھی امیر بنے وہ سعد سے مدد و معاونت لے، کیونکہ میں نے انہیں عجز، کمزوری اور خیانت کی وجہ سے معزول نہیں کیا تھا''۔ [1]

اور صحیح مسلم میں سیدنا ابی ذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں:''میں نے عرض کیا کہ:اے اللہ کے رسول کیا آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) مجھے کوئی ذمہ داری نہیں سونپیں گے تو؟ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنا ہاتھ مبارک میرے کندھے پر مار کر فرمایا اے ابوذر تو کمزور ہے اور یہ امارت امانت ہے اور یہ قیامت کے دن کی رسوائی اور شرمندگی ہے سوائے اس کے جس نے اس کے حقوق پورے کئے اور اس بارے میں جو اس کی ذمہ داری تھی اس کو ادا کیا''۔ [2]

ایک مقام پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابوذر رضی اللہ عنہ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:''اے ابوذر (رضی اللہ عنہ) میں تجھے ضعیف و ناتواں خیال کرتا ہوں اور میں تیرے لئے وہی پسند کرتا ہوں جو اپنے لئے پسند کرتا ہوں تم دو آدمیوں پر کبھی حاکم نہ بننا اور نہ مال یتیم کا والی بننا''۔ [3]

---

[1] صحیح البخاری ،باب قصة البیعة والاتفاق علی عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ،حدیث:3700

[2] صحیح البخاری،باب کراهة لإ مارة بغیره ضرورة،حدیث:1825

[3] صحیح مسلم،باب کراهة لإ مارة بغیره ضرورة،حدیث:1826

بڑے ذمہ داران محنت ولگن اور سستی وکاہلی میں چھوٹے ملازمین کیلئے نمونہ (آئیڈیل) ہوتے ہیں

اگر بڑے ذمہ داراں اور افسران اپنی ذمہ داریاں کماحقہ بدرجہ اتم واکمل ادا کریں گے تو چھوٹے اور ان کے ماتحت ملازمین ان کے تابع ہوں گے، کام میں ہر ذمہ دار سے اس کی ذمہ داری اور اس کے تابع لوگوں سے متعلق پوچھا جائے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ''تم میں سے ہر ایک نگران ہے اور تم میں سے ہر ایک سے باز پرس ہوگی چنانچہ حکمران اپنی رعایا کے ذمہ دار ہیں اور ان سے ان کی رعایا کے حوالے سے باز پرس ہوگی مرد اپنے اہل خانہ کا ذمہ دار ہے اور اس کے متعلق باز پرس ہوگی عورت اپنے خاوند کے گھر اور بچوں کی ذمہ دار ہے اور اس سے اس کی باز پرس ہوگی غلام اپنے آقا کے مال کا ذمہ دار ہے اور اس سے اس کے متعلق باز پرس ہوگی الغرض تم میں سے ہر ایک نگران ہے اور تم میں سے ہر ایک سے اس کی رعایا کے متعلق باز پرس ہوگی''۔ [1]

بڑے افسران تمام وقت اگر اپنے کام پابندی سے اور وقت کا لحاظ رکھتے ہوئے انجام دیں گے تو وہ دوسروں کیلئے ایک بہت بڑی مثال اور نمونہ بن جائیں گے۔ بقول شاعر:

وَإِنَّكَ إِذْمَا تَأْتِ مَا أَنْتَ آمِرٌ   بِهِ تُلْفِ مَنْ إِيَّاهُ تَأْمُرُ آتِيَا

اس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ: اگر تم نے اپنے کسی ماتحت کو کوئی کام سرانجام دینے کا حکم دیا اور تم خود بھی اپنے واجبات اور ذمہ داریاں ادا کرنے میں پہل کرتے رہتے ہو تو تمہارا ماتحت بھی تمہارے آرڈر پر لبیک کہتا ہوا تم نے جو اسے حکم دیا ہے اسے بجالائے گا۔''

ملازم وافسر کو چاہیے کہ وہ لوگوں کے ساتھ اس رویہ سے پیش آئے جو وہ خود اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

اسلام میں نصیحت کی قدر ومنزلت بہت عظیم ہے۔ اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''دین خیر خواہی کا نام ہے، ہم نے عرض کیا کس چیز کی؟ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ کی، اس کی کتاب کی، اس کے

---

[1] صحیح البخاری، باب الجمعة فی القری والمدنی، حدیث: 893

رسول کی، مسلمانوں کے ائمہ کی اور تمام مسلمانوں کی۔'' (1)

جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے نماز پڑھنے اور زکوۃ دینے اور ہر مسلمان سے خیرخواہی کرنے (کے اقرار) پر بیعت کی۔'' (2)

اور اسی طرح جیسا کہ ہر افسر اور ملازم کی اگر کسی اور کے پاس ضرورت ہو اس کا کسی اور سے کام ہو تو وہ پسند کرتا ہے کہ وہ غیر اس کے ساتھ اچھا معاملہ کرے، تو اس ملازم پر بھی پھر ضروری ہے کہ وہ لوگوں کے ساتھ اچھا معاملہ کرے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ''جس کو یہ بات پسند ہو کہ اسے جہنم سے دور رکھا جائے اور جنت میں داخل کیا جائے تو اسے چاہیے کہ اس کی موت اس حال میں آئے کہ وہ اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اور لوگوں کے ساتھ اس معاملہ سے پیش آئے جس کے کیے جانے کو اپنے لئے پسند کرے۔'' (3)

اس روایت کا مفہوم یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ اور برتاؤ کرو جو تم اپنے لئے پسند کرتے ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے: ''تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک (کامل) مومن نہیں بن سکتا، جب تک کہ اپنے مسلمان بھائی کے لئے وہی نہ چاہے جو اپنے لئے چاہتا ہے''۔ (4)

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابِ حکیم میں ان لوگوں کی مذمت کی ہے جو لوگوں کے ساتھ اس کے برخلاف معاملہ کرتے ہیں جو وہ اپنے لئے چاہتے ہیں۔ چنانچہ فرمان باری تعالیٰ ہے: ﴿وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ ۝ الَّذِينَ إِذَا اكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ ۝ وَإِذَا كَالُوهُمْ أَوْ وَّزَنُوهُمْ يُخْسِرُونَ﴾ (المطففین: 1-3)

ترجمہ: ''بڑی خرابی ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کی۔ کہ جب لوگوں سے ناپ کر لیتے ہیں تو پورا

(1) صحیح مسلم، حدیث 55

(2) صحیح البخاری، حدیث: 37، صحیح مسلم، حدیث: 56

(3) صحیح مسلم، حدیث: 1844

(4) صحیح البخاری، حدیث: 13۔ صحیح مسلم، حدیث: 45

پورا لیتے ہیں۔اور جب لوگوں سے ناپ کر لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں۔''

افسران اور ملازمین کو چاہئے کہ وہ ضرورت مندوں کے مسائل پہلے آیئے پہلے پایئے کی بنیاد پر حل کریں۔

عدل اور انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ کسی بھی ملازم اور افسر کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ دیر سے آنے والے کا معاملہ پہلے حل کر دے اور پہلے آنے والے کو لٹکائے رکھے، بلکہ اسے چاہئے کہ پہلے پہل کرنے والے کا دیر سے آنے والے کے معاملہ سے پہلے معاملہ حل کر دے پہلے آنے والے کو لٹکا کر نہ رکھے۔اسی میں ملازم اور ضرورت مندوں دونوں کے لیے آرام اور آسانی ہے۔

سیدنا ابوھریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ" (ایک دن) نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مجلس میں لوگوں سے (کچھ) بیان کر رہے تھے کہ اسی حالت میں ایک اعرابی آپ کے پاس آیا اور اس نے پوچھا کہ قیامت کب قائم ہوگی؟ تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) (نے کچھ جواب نہ دیا اور اپنی بات) بیان کرتے رہے، اس پر کچھ لوگوں نے کہا کہ آپ نے اس کا کہنا سن (تو) لیا، مگر (چونکہ) اس کی بات آپ کو بری معلوم ہوئی، اس سبب سے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جواب نہیں دیا اور کچھ لوگوں نے کہا کہ (یہ بات نہیں ہے) بلکہ آپ نے سنا ہی نہیں، یہاں تک کہ جب آپ اپنی بات ختم کر چکے تو فرمایا کہ کہاں ہے قیامت کا پوچھنے والا؟ سائل نے کہا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں موجود ہوں، آپ نے فرمایا جس وقت امانت ضائع کر دی جائے تو قیامت کا انتظار کرنا، اس نے پوچھا کہ امانت کا ضائع کرنا کس طرح ہوگا؟ آپ نے فرمایا جب کام نااہل (لوگوں) کے سپرد کیا جائے، تو قیامت کا انتظار کرنا۔''[1]

اس حدیث میں دلالت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سائل کا جواب فوراً نہیں دیا بلکہ جو پہلے لوگ موجود تھے انہیں وعظ کرتے رہے پھر سائل کو جواب دیا۔

---

[1] صحیح البخاری،باب من رفع صوتہ بالعلم،حدیث59

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ ابن جریر طبری کے حوالے سے نقل کرتے ہیں کہ عثمان بن احمد الدینوری فرماتے ہیں: ایک دفعہ میں ابن جریر طبری کی مجلس میں حاضر ہوا اس وقت ایک وزیر فضل بن جعفر بن فرات بھی اسی مجلس میں حاضر تھا اس وزیر سے پہلے ایک شخص آیا تھا۔ امام طبری اس پہلے آنے والے شخص سے کہنے لگے کیا تم نہیں پڑھو گے؟ اس نے وزیر کی طرف اشارہ کیا کہ یہ پہلے پڑھ لیں۔ اس پر امام طبری رحمہ اللہ فرمانے لگے اگر باری آپ کی ہے تو آپ کو کسی دجلہ فرات (یعنی وزیر امیر) کی پرواہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ابن حجر فرماتے ہیں: یہ ابن جریر رحمہ اللہ کے لطائف اور بلاغت اور ابناء دنیا سے بے رغبتی و بے پرواہی کی جیتی جاگتی مثال ہے۔"

ملازم اور افسر خود کو خودداری اور امانت داری سے متصف رکھتے ہوئے رشوت اور تحفوں سے بچا کر رکھنا چاہیے۔

ہر ملازم کیلئے ضروری ہے کہ وہ اپنی عزت نفس اور عفت کا خیال رکھے اور اسے غنی القلب ہونا چاہئے لوگوں کے مال پر نظر نہ رکھے اور ان کا مال باطل طریقوں سے نہ کھائے جو کہ اسے رشوت کی شکل میں دیا جاتا ہے چاہے اسے ہدیہ (گفٹ، تحفہ) ہی کیوں نہ کہا جائے، کیونکہ اگر اس نے لوگوں سے ناجائز مال بٹورا تو اس نے باطل ذریعے سے لوگوں کا مال کھایا، اور باطل ذریعے سے لوگوں کا مال کھانا دعا کی عدم قبولیت کا سبب ہے۔

صحیح مسلم میں سیدنا ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "اے لوگو اللہ پاک ہے اور پاک ہی کو قبول کرتا ہے اور اللہ نے مومنین کو بھی وہی حکم دیا ہے جو اس نے رسولوں کو دیا اللہ نے فرمایا: "اے رسولو! تم پاک چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو میں تمہارے عملوں کو جاننے والا ہوں" اور فرمایا: "اے ایمان والو ہم نے جو تم کو پاکیزہ رزق دیا اس میں سے کھاؤ" پھر ایسے آدمی کا ذکر فرمایا جو لمبے لمبے سفر کرتا ہے پراگندہ بال جسم گرد آلود اپنے ہاتھوں کو آسمان کی طرف دراز کر کے کہتا ہے اے رب اے رب! حالانکہ اس کا

کھانا حرام اور اس کا پہننا حرام اور اس کا لباس حرام اور اس کی غذا حرام تو اس کی دعا کیسے قبول ہو!؟''۔ [1]

لوگوں کا مال باطل اور ناحق کھانے کی مذمت میں واضح ترین یہ روایت بھی ہے جو صحیح بخاری میں جندب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں ''انسان کے جسم کے اعضاء میں سب سے پہلے اس کا پیٹ سڑتا ہے اس لئے اگر کوئی پاکیزہ چیز ہی کھا سکے تو ایسا ہی کرے۔ اور جو شخص یہ چاہے کہ اس کے اور بہشت کے درمیان چلو بھر خون جو اس نے ناحق بہایا ہو حائل نہ ہو تو اسے چاہیے کہ وہ تو ایسا ہی کرے۔'' [2]

اور سیدنا ابوھریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''لوگوں پر ایک زمانہ ایسا بھی آئے گا جس میں آدمی کو اس چیز کی کوئی پرواہ نہ ہوگی کہ وہ حلال طریقے سے مال حاصل کر رہا ہے یا حرام طریقے سے۔'' [3]

رشوت خوروں نے یہ تکیہ کلام بنالیا ہے کہ جو ہاتھ میں آ گیا وہ حلال ہے اور حرام وہ ہے جو ہماری دسترس میں نہیں (یہ اصول بھونڈا اور ناقابل قبول ہے) بلکہ حلال وہ ہے جسے اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حلال کردے اور حرام وہ ہے جسے اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حرام کر دیں۔

ذخیرہ حدیث میں متعدد ایسی حدیثیں ہیں جن میں ملازمین اور افسران کو اس چیز سے منع کیا گیا ہے کہ وہ لوگوں کے مال سے کوئی چیز لیں چاہے وہ ہدیہ ہی کیوں نہ ہو۔

ان میں ایک روایت ابی حمید الساعدی رضی اللہ عنہ کی بھی ہے فرماتے ہیں: ''رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بنو اسد میں سے ایک آدمی کو زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے عامل مقرر فرمایا جسے ابن لتبیہ کہا جاتا تھا جب وہ واپس آیا تو اس نے کہا یہ تمہارے لئے ہے اور یہ میرے لئے ہے جو مجھے ہدیہ دیا گیا ہے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) منبر پر تشریف فرما ہوئے اللہ کی حمد وثنا بیان کی اور فرمایا اس ملازم کا کیا حال ہے جسے میں نے صدقہ وصول کرنے

---

[1] صحیح البخاری، حدیث: 1015

[2] صحیح البخاری، حدیث: 7152

[3] صحیح البخاری، حدیث: 2083

کے لئے بھیجا وہ آکر کہتا ہے کہ یہ تمہارے لئے اور یہ مجھے ہدیہ دیا گیا ہے اس نے اپنے باپ یا ماں کے گھر میں بیٹھے ہوئے کا انتظار کیوں نہ کیا کہ اس کو ہدیہ دیا جاتا ہے یا نہیں اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی جان ہے تم میں سے جس نے بھی اس مال میں سے کوئی چیز لی تو وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس مال کو اپنی گردن پر اٹھائے ہوگا اونٹ بڑبڑاتا ہوگا یا گائے ڈکار رہی ہوگی یا بکری منمناتی ہوگی پھر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے ہاتھوں کو اتنا بلند کیا کہ ہم نے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بغلوں کی سفیدی دیکھی پھر دو مرتبہ فرمایا اے اللہ میں نے پیغام پہنچادیا۔''[1]

سیدنا ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک دن ہمارے سامنے خطبہ ارشاد فرمایا اور (اس خطبہ کے دوران) مال غنیمت میں خیانت کا ذکر فرمایا چنانچہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کو بہت بڑا گناہ بتایا اور بڑی اہمیت کے ساتھ اس کو بیان کیا اور پھر فرمایا کہ) ''خبردار'' میں تم سے کسی کو قیامت کے دن اس حال میں نہ دیکھوں کہ وہ اپنی گردن پر بلبلاتے ہوئے اونٹ کو لادے ہوئے (میدان حشر میں) آئے (یعنی جو شخص مال غنیمت میں سے مثلاً اونٹ کی خیانت کرے گا وہ شخص میدان حشر میں اس حالت میں آئے گا کہ اس کی گردن پر وہی اونٹ سوار ہوگا اور بلبلا رہا ہوگا) اور پھر مجھ سے یہ کہے کہ یارسول اللہ! میری فریادرسی (شفاعت) کیجئے اور میں اس کے جواب میں یہ کہہ دوں کہ میں (اب) تمہاری کسی چیز کا ذمہ دار نہیں ہوں کیونکہ میں نے تمہیں شریعت کے احکام پہنچا دیئے تھے (یعنی تمہیں پہلے ہی آگاہ کر دیا گیا تھا کہ مال غنیمت میں خیانت یا کسی چیز میں ناحق تصرف بہت بڑا گناہ ہے)۔ (اور خبردار) میں تم سے کسی کو قیامت کے دن اس حال میں نہ دیکھوں کہ وہ اپنی گردن پر ممیاتی ہوئی بکری لادے ہوئے (میدان حشر میں) آئے اور پھر مجھ سے یہ کہے کہ یارسول اللہ! میری فریادرسی کی جائے اور میں اس کے جواب میں یہ کہہ دوں کہ میں (اب) تمہاری کسی چیز کا ذمہ دار نہیں ہوں کیونکہ میں نے تمہیں شریعت کے احکام پہنچا دیئے تھے۔ (اور خبردار!) میں تم میں سے کسی کو قیامت کے دن اس حال میں نہ دیکھوں کہ وہ اپنی گردن پر کسی چلاتے ہوئے

---

[1] صحیح البخاری، حدیث: 7174۔ صحیح مسلم، حدیث: 1832

آدمی کو (یعنی اس غلام یا باندی کو جو اس نے غنیمت کے قیدیوں میں سے خیانت کر کے لئے ہوں) لادے ہوئے (میدان حشر میں) آئے اور پھر مجھ سے یہ کہے کہ یارسول اللہ! میری فریاد رسی کیجئے اور میں اس کے جواب میں یہ کہہ دوں کہ میں (اب) تمہاری کسی چیز کا ذمہ دار نہیں ہوں کیونکہ میں نے تمہیں شریعت کے احکام پہنچا دیئے تھے۔ (اور خبردار! میں تم سے کسی کو قیامت کے دن اس حال میں نہ دیکھوں کہ وہ اپنی گردن پر لہراتے ہوئے کپڑے رکھے ہوئے (میدان حشر میں) آئے اور پھر مجھ سے یہ کہے کہ یارسول اللہ! میری فریاد رسی کیجئے اور میں اس کے جواب میں یہ کہے دوں کہ میں (اب) تمہاری کسی چیز کا ذمہ دار نہیں ہوں کیونکہ میں نے تمہیں شریعت کے احکام پہنچا دیئے تھے۔ (خبردار!) میں تم میں کسی کو قیامت کے دن اس حال میں نہ دیکھوں کہ وہ اپنی گردن پر سونا چاندی لادے ہوئے (میدان حشر میں) آئے اور پھر مجھ سے یہ کہے کہ یارسول اللہ! میری فریاد رسی کیجئے اور میں اس کے جواب میں یہ کہہ دوں کہ میں (اب) تمہاری کسی چیز کا ذمہ دار نہیں ہوں کیونکہ میں نے تمہیں شریعت کے احکام پہنچا دیئے۔''[1]

ابی حمید الساعدی رضی اللہ عنہ سے ایک اور روایت مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''عمال کے ہدایا اور تحائف خیانت ہیں۔''[2]

عدی بن عمیرہ فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ: ''ہم تم میں سے جس کسی کو کسی کام (یعنی زکوٰۃ وغیرہ وصول کرنے) پر مقرر کریں اور وہ شخص ہم سے سوئی کے برابر یا اس سے کم و بیش چیز کو چھپائے تو یہ خیانت میں شمار ہوگا جو اسے روز قیامت رسوا کر کے لائے گا۔''[3]

سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ہم نے جس کو بھی کسی کام پر مامور کیا ہو تو اس کا وظیفہ اور تنخواہ مقرر کی ہو پھر اس کے بعد جو کچھ وہ اس سے زائد حاصل کرے وہ چوری اور خیانت ہے۔''[4]

---

[1] صحیح البخاری، حدیث: 3073۔ صحیح مسلم، حدیث: 1831

[2] مسند احمد: 23601۔ ارواء الغلیل للألبانی: 2622

[3] صحیح مسلم، حدیث: 1833

[4] سنن ابی داود، حدیث: 2943، علامہ البانی نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

ابن جوزی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب صفۃ الصفوۃ میں عیاض بن غنم رضی اللہ عنہ کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ ''وہ حمص پر عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے امیر مقرر تھے انہوں نے اپنے چند قرابت داروں کو کہا کہ ''اللہ کی قسم! میں آرے سے چیر دیا جاؤں یہ مجھے زیادہ پسند ہے اس چیز سے کہ میں ایک فلس پائی کی بھی خیانت یا زیادتی کروں۔''

علامہ ابن القیم رحمہ اللہ اپنی شہرہ آفاق تصنیف اعلام الموقعین میں سدّ ذرائع کے دلائل کی بحث کے ضمن میں لکھتے ہیں: ''امیر، قاضی اور شفاعت کنندہ کیلئے ہدیہ قبول کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ دنیا کی تباہی کی بنیادی وجہ یہی ہے اور اس کے ساتھ غیر اہل خائن، کمزور اور عاجز لوگوں کو مناصب پر فائز کرنا۔ اس کی وجہ سے معاشرے میں ایسا فساد اور بگاڑ پیدا ہوا کہ الحفیظ والامان۔

یہ اس وجہ سے کہ جس شخص کی ہدایا قبول کرنے کی عادت نہیں ہوتی منصب سنبھالنے کے بعد اگر اس کی ان تحائف سے خاطر مدارت شروع کر دی جائے تو اس میں ہدیہ دینے والے کی ضرورت پوری کرنے پر اس کا دل مائل ہو جاتا ہے۔ اور کسی چیز کی محبت آپ کو اندھا اور بہرا کر سکتی ہے۔ اس سے اس صاحب منصب کی عادت بن جائے گی کہ وہ ہر انسان کی ضرورت پوری کرتے وقت اس سے کسی معاوضہ (بنام تحفہ) کی امید لگا بیٹھے گا۔۔۔۔ [1]

آخر میں میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ہر مسلمان ملازم وافسر کو اپنے کام اس طرح کرنے کی توفیق عطا کرے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا اس کے شامل حال رہے۔ اور وہ کام اس کیلئے دنیا وآخرت میں باعث ثواب اجر اور اچھے انجام کا سبب بنے۔

وصلی اللہ وسلم وبارک علی عبدہ ورسولہ نبینا محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ اجمعین۔

---

[1] ابن قیم رحمہ اللہ نے یہاں جس خطرے کی طرف اشارہ کیا ہے اس کا مشاہدہ ہم اپنے آج کے معاشرہ میں بخوبی کر رہے ہیں۔ جس بھی محکمے میں آپ تشریف لے جائیں وہاں کرسی پر براجماں سرکاری ذمہ دار آپ سے اسی مٹھائی کی امید رکھے گا اگر آپ نے اسے کوئی لولی پاپ آغاز میں دے دیا تو آپ کا کام جلد ہو جائے گا ورنہ آپ اپنی جوتی گھسٹتے گھسٹتے تھک جائیں گے آپ کا کام نہیں ہوگا۔ یعنی جائز کام کرانے اور تمام شرائط وضوابط کے مکمل ہونے کے بعد بھی اس افسر کے منہ کو حرام لگائے بغیر کام کرانا مشکل ہو چکا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اس کرسی پر بیٹھا شخص یہ سمجھتا ہے کہ میں اس کا کام کر رہا ہوں لہذا میں اس سے تحفے کا حق رکھتا ہوں۔

بچے کی ولادت

کے موقع پر پڑھی جانے والی دعائیں

حافظ محمد یونس اثری[1]

شریعت اسلامیہ کی وسعت ورحمت ہے کہ اس میں ہر اہم موقع سے متعلق رہنمائی موجود ہے، یہ ایسے مواقع ہیں جہاں تعلق باللہ اور دعائیں ناگزیر ہوتی ہیں، ان مواقع سے متعلق جو دعائیں خصوصی طور پر منقول یا مسنون ہوں وہ بڑی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں، کیونکہ کس موقع پر کس دعا یا ذکر کی ضرورت ہے؟ اور اس کے کیا فوائد وثمرات ہیں یہ شریعت سے ہی معلوم ہوسکتا ہے، یہی وجہ ہے ان خاص مواقع پر سنت پر عمل پیرا ہونے سے نہ صرف ہم شرعی مطلوب کو بجالانے کے اجر سے مستفید ہوتے ہیں بلکہ یقینی طور پر دنیا میں ان کے دیگر فوائد بھی حاصل ہوتے ہیں۔ انہی دعاؤں میں سے ایک دعا بالخصوص بچے کی ولادت کے تعلق سے ہے کہ ہمارے مسلمان بھائی کو جب اولاد جیسی نعمت میسر ہو تو اس موقع پر ہمیں اسے کس قسم کی دعا دینی چاہئے؟ اس مضمون میں اسی حوالے سے کچھ گزارشات پیش کی جائیں گی۔ ہمارا مضمون اس حوالے سے درج ذیل نکات پر مشتمل ہے۔

❁ بچے کی ولادت کے موقع پر مسنون دعا کون سی ہے؟

---

[1] ریسرچ اسکالر المدینہ اسلامک ریسرچ سینٹر کراچی

❁ اس حوالے سے عام طور پر لوگ مبارک ہو یا اس جیسے دیگر کلمات کہہ دیتے ہیں، یہ کیسا ہے؟

اب ان سطور میں مسئلہ زیر بحث پر تفصیل سے روشنی ڈالی جاتی ہے۔

کیا بچے کی ولادت کے موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی مرفوع الفاظ ثابت ہیں؟

جی ہاں! اس موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے برکت کی دعا دینا یا اس کے لئے خاص الفاظ کا استعمال کرنا ثابت ہے۔

چنانچہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا حمل سے تھیں اور ان دنوں حمل کی مدت بھی پوری ہو چکی تھی، فرماتی ہیں کہ میں مدینہ کے لئے روانہ ہوئی وہاں پہنچ کر میں نے قبا میں پڑاؤ کیا اور وہیں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے۔ پھر میں انہیں لے کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گود میں اسے رکھ دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک کھجور طلب فرمائی اور اسے چبا کر عبداللہ رضی اللہ عنہ کے منہ میں رکھ دیا۔ چنانچہ سب سے پہلی چیز جو عبداللہ رضی اللہ عنہ کے پیٹ میں داخل ہوئی وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مبارک لعاب تھا۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے لئے برکت کی دعا فرمائی۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ وہ سب سے پہلے بچے ہیں جن کی پیدائش ہجرت کے بعد ہوئی۔[1]

اس حدیث میں بالکل مطلق الفاظ "وَبَرَّكَ عَلَيْهِ" کے استعمال ہوئے، یعنی ان کے لئے برکت کی دعا فرمائی۔

اسی مفہوم کی ایک اور روایت سیدنا ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ میرے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا تو میں اسے لے کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کا نام ابراہیم رکھا اور کھجور کو اپنے دندان مبارک سے نرم کر کے اسے چٹایا اور اس کے لیے برکت کی دعا کی پھر

---

[1] صحيح البخاری: حديث: (3909)، كتاب مناقب الانصار، باب هجرة النبي صلى الله عليه وسلم وأصحابه إلى المدينة

مجھے دے دیا۔ یہ ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کے سب سے بڑے لڑکے تھے۔[1]

اس روایت کے الفاظ ہیں:

”وَدَعَا لَهُ بِالْبَرَكَةِ“

یعنی ان کے لئے برکت کی دعا کی۔

مذکورہ روایات میں مطلق طور پر برکت کی دعا کا تذکرہ تو ہے لیکن دعا کرنے کے من وعن الفاظ کیا تھے؟ یہ واضح نہیں ہے، لہذا اس موقع پر دعائے برکت تو ثابت ہوگئی لیکن اس کے کوئی مخصوص الفاظ ان نصوص میں موجود نہیں۔ البتہ بعض روایات میں چند کلمات کی صراحت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ دعائیہ کلمات ادا فرمائے، جیسا کہ:

سیدہ ام سلیم رضی اللہ عنہا کا ایک قصہ جو کہ متعدد اسانید کے ساتھ حدیث کی مختلف کتب میں موجود ہے اور صحیح بخاری میں بھی ہے، البتہ مسند بزار میں کچھ زائد الفاظ کے ساتھ وہ قصہ مروی ہے اور انہی سے ہمارا استدلال ہے، لہذا مسند بزار کا وہ قصہ ملخصاً ذکر کر رہے ہیں:

سیدہ ام سلیم رضی اللہ عنہا (چونکہ مسلمان ہو چکی تھیں اور ان کے شوہر مالک بن نضر کافر تھے) ام سلیم رضی اللہ عنہا نے ان سے علیحدگی اختیار کرلی۔ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے انہیں نکاح کا پیغام بھیجا تو انہوں نے پوچھا کہ تم نے اسلام قبول کیا ہے؟ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے کہا: نہیں۔ جواب دیا جب تک اسلام قبول نہیں کرو گے میں تم سے نکاح نہیں کرسکتی۔ بلکہ کہا کہ اسلام قبول کرو تو بس یہی میرا حق مہر ہے۔ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا اور ام سلیم رضی اللہ عنہا سے نکاح کرلیا۔ اللہ تعالیٰ نے بچے سے نوازا، جو کہ بیمار ہوگیا اسی اثناء میں ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کو کسی کام سے جانا پڑا اور جب واپس لوٹے رات کا وقت تھا۔ اور ان کا بیٹا دارِ فانی کو چھوڑ چکا تھا۔ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے آتے ہی بچے کے بارے میں پوچھا تو ام سلیم رضی اللہ عنہا کو چونکہ اپنے خاوند کی سفر سے واپسی کی وجہ سے تھکاوٹ کا احساس تھا، اس لئے اس وقت بچے کی وفات کی اطلاع دینا مناسب نہ سمجھا، لہذا کہہ دیا کہ پہلے سے بہتر ہے، (یقیناً پہلے

---

[1] صحیح البخاری :حدیث:(5467)، کتاب العقیقة،باب تسمیة المولود غداة یولد، لمن لم یعق عنه، وتحنیکه

سے بہتر تھا کہ اب اس کی روح دنیا چھوڑ کر اعلیٰ علیین کی طرف پرواز کر چکی تھی) انہوں نے شکم سیر ہو کر کھانا کھایا پھر بیوی سے صحبت بھی کی، جب سب کاموں سے فارغ ہو کر بالکل ہی مطمئن ہو گئے تو ام سلیم رضی اللہ عنہا نے کہا: مجھے یہ مسئلہ بتائیے کہ اگر ہمارے پاس کسی کی کوئی امانت ہو اور وہ اپنی امانت ہم سے لے لے تو کیا ہم کو برا ماننے یا ناراض ہونے کا کوئی حق ہے؟ ابو طلحہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ہرگز نہیں، امانت والے کو اس کی امانت خوشی خوشی دے دینی چاہیئے۔ شوہر کا یہ جواب سن کر ام سلیم رضی اللہ عنہا نے کہا: ''آج ہمارے گھر میں یہی معاملہ پیش آیا کہ ہمارا بچہ جو ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کی ایک امانت تھا آج اللہ تعالیٰ نے وہ امانت واپس لے لی اور ہمارا بچہ مر گیا یہ سن کر ابو طلحہ چونک کر اٹھ بیٹھے اور حیران ہو کر بولے کہ کیا میرا بچہ مر گیا؟ بچے کی میت دیکھ کر پڑھا: انا للہ و انا الیہ راجعون۔ اور صبح فجر کی نماز میں گئے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے ساری روئیداد رکھ دی۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''وَالَّذِي بعثني بِالْحَقِّ، لَقَدْ قَذَفَ اللهُ تَعَالَى فِي رَحِمِهَا ذَكَرًا، لِصبرها عَلَى وَلَدِهَا''[1]

یعنی: ''قسم ہے اس ذات کی جس نے مجھے حق کے ساتھ بھیجا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس (ام سلیم رضی اللہ عنہا) کے اپنے بچے کی وفات پر صبر کرنے کی وجہ سے اس کے بطن میں ایک بچہ عطا فرما دیا ہے۔''

پھر جب ام سلیم رضی اللہ عنہا کے یہاں بچے کی ولادت ہوئی، نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بچے کو منگوایا اور کھجور نرم کر کے اس کے منہ میں ڈالی، اور انس رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''اسے اپنی والدہ کے پاس لے جاؤ۔'' اور ان سے کہنا:

'' بَارَكَ اللهُ لَكِ فِيهِ، وَجَعَلَهُ بَرًّا تَقِيًّا''

یعنی: ''اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اس بچے میں برکت عطا فرمائے اور اسے نیک صالح اور متقی بنائے۔''

مذکورہ واقعہ میں آخر میں درج کئے گئے الفاظ سے واضح ہے کہ بچے کی ولادت کے موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کن الفاظ میں مبارکباد دی۔

---

[1] مسند بزار، حدیث: 7310

اردو یا کسی اور زبان میں مطلق طور پر ''مبارک ہو'' کے الفاظ کہنا کیسا ہے؟

کہ یہ بھی برکت کی دعا کے ہی کلمات ہیں لہذا ایسا کہنا جائز وصحیح ہے۔اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی احادیث جن میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے برکت کی دعا کی، اس طرح کے کلمات سے ان پر عمل ہو جائے گا۔

اس موقع پر پڑھی جانے والی مشہور دعا کا جائزہ

واضح رہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مسنون دعا کا تذکرہ ہو چکا البتہ بعض دعائیں چند ایک آثار کی بنیاد پر دعاؤں کی کتب میں موجود ہیں اور اہل علم بھی ان کو پڑھتے ہیں جیسا کہ:

''بارَكَ الله لَكَ فِي الْمَوْهُوبِ لَكَ،وشَكَرْتَ الْوَاهِبَ وَبَلَغَ أَشدَّهُ،وَرُزِقْتَ بِرَّهُ۔''[1]

یعنی: ''اللہ تعالیٰ اس بچے میں برکت عطا فرمائے اور تم دینے والے کا شکر ادا کرو اور یہ بچہ شعور کی عمر کو پہنچے اور اس کی نیکی سے نوازے جاؤ۔''

یہ اثر مسند ابن الجعد میں حسن بصری رحمہ اللہ سے بیان کرنے والے الھیثم بن الجماز ہیں، جس پر خود ابن الجعد رحمہ اللہ نے یحی ابن معین رحمہ اللہ کی جرح کو نقل کیا کہ انہوں نے اسے ضعیف قرار دیا۔ نیز اسے امام احمد رحمہ اللہ، امام نسائی رحمہ اللہ نے متروک اور ابن معین رحمہ اللہ نے کہا:''کان قاصا'' یعنی: قصہ گو تھا۔[2]

یہ اثر تاریخ دمشق میں حسن بصری رحمہ اللہ سے بیان کرنے والے کلثوم بن الجوشن ہیں، اور تاریخ دمشق ہی کے حوالے سے علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے اسے وصول الأمانی بأصول التھانی میں ذکر کیا اور اس کے محقق یحی بن علی الحجوری نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔[3]

---

[1] تاریخ دمشق :275/59، ترجمہ معاویة بن محمد بن دینویه ،مسند ابن الجعد، حدیث:3398

[2] میزان الاعتدال ترجمہ نمبر:6968، ج/3، ص/413

[3] وصول الأمانی بأصول التھانی، ص:36، طبع دار الامام احمد قاھرہ

ابن معین رحمہ اللہ نے کلثوم بن الجوشن کو لیس بہ باس کہا،[1] ابن حبان رحمہ اللہ اسے کتاب الثقات میں بھی لائے اور المجروحین میں لاکر سخت جرح بھی کی، یہ بات معلوم ہے کہ ابن حبان رحمہ اللہ توثیق میں متساہل اور جرح میں متشدد ہیں، یہی وجہ ہے کہ علامہ البانی رحمہ اللہ نے ان کے اس کلام کو مبالغہ آمیزی قرار دیا۔[2]

امام ابوداؤد رحمہ اللہ نے منکر الحدیث اور ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ضعیف قرار دیا۔ علامہ الالبانی رحمہ اللہ نے ایک روایت کی تحقیق کے دوران ان سے متعلقہ یہ دونوں قسم کے کلام نقل کرنے کے بعد فرمایا: ''فھو وسط حسن الحدیث إن شاء اللہ تعالی ''،[3] یعنی یہ حسن درجہ کا راوی ہے۔ ان شاء اللہ

علامہ شعیب الارناؤط نے بھی ایک روایت کی تحقیق کے دوران اسے مختلف فیہ قرار دینے کے بعد کہا کہ ایسے راوی کی روایت حسن فی الشواہد کے درجے کی ہے۔[4]

بہر حال ان بڑوں کی بات مانتے ہوئے اگر کلثوم بن الجوشن کو حسن الحدیث مان لیں اور اس اثر کو قبول کرلیں مزید یہ کہ کئی ایک کبار اہل علم کی کتب میں اس اثر کا منقول و متداول ہونا اور معمول بہ ہونا اپنی جگہ لیکن مقطوع و مرفوع کی تمیز ایک ضروری امر ہے جس کی اہمیت و ضرورت سے کوئی ذی علم انکاری نہیں، نیز مذکورہ اثر میں موجود دعا کو مسنون (یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت) سمجھنا صحیح نہیں۔

حسن بصری رحمہ اللہ سے ایک اور دعا بھی اس حوالے سے منقول ہے۔ جو کہ یہ ہے:

حسن بصری رحمہ اللہ کی مجلس میں کسی شخص کے یہاں بچے کی ولادت کی اطلاع دی گئی اسے دوسرے شخص نے مبارکباد دیتے ہوئے کہا: ''تمہیں ایک گھوڑ سوار کی مبارکباد ہو''

اس پر حسن بصری رحمہ اللہ گویا ہوئے: ''تمہیں کیا معلوم کہ وہ گھوڑ سوار ہوگا یا درزی ہوگا یا نجار بڑھئی ؟''

---

[1] ابن معین رحمہ اللہ لیس بہ باس کہیں تو وہ ان کے یہاں ثقہ ہوتا ہے، دیکھئے محدث العصر الاستاذ ارشاد الحق اثری حفظہ اللہ کی کتاب ضوابط الجرح والتعدیل، صفحہ نمبر: 96، مطبوع المدینہ اسلامک ریسرچ سینٹر کراچی

[2] سلسلة الأحاديث الصحيحة، حديث: 3453

[3] سلسلة الاحاديث الصحيحة، حديث: 3453

[4] سنن ابن ماجة مع تحقيق شعيب الارناؤط حديث: 2139

اس نے کہا: ”پھر کن الفاظ میں اسے مبارکباد دوں؟“

انہوں نے فرمایا یہ کہو: ”جَعلَهُ اللّٰهُ مُبَارَكًا عَلَيْكَ وَعَلَى أُمَّةِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وسلم“[1]

یعنی: اللہ تعالیٰ اسے آپ کے لئے اور امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے بابرکت بنائے۔

یہی الفاظ ایوب سختیانی رحمہ اللہ سے بھی منقول ہیں۔[2]

تنبیہ نمبر 1

بعض اہل علم کا امام نووی رحمہ اللہ کا اسے سیدنا حسین بن علی رضی اللہ عنہ سے منقول قرار دینا صحیح نہیں۔ صحیح یہی ہے کہ یہ سیدنا حسن بصری رحمہ اللہ کا اثر ہے۔ کیونکہ تاریخ دمشق، مسند ابن الجعد اور الدعاء للطبرانی کما نقلہ السیوطی میں یہ حسن بصری رحمہ اللہ کا ہی قول ہے۔ انہی سے نقل کی بنیاد پر دیگر سے بھی یہ خطا ہوئی ہے، جیسا کہ صاحب فتح الربانی نے بھی امام نووی رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہوئے، سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کا ہی نام لکھا۔

تنبیہ نمبر 2

اس دعا کو مختلف اہل علم نے الفاظ کی تقدیم و تاخیر کے ساتھ ذکر کیا ہے، مثلاً

تاریخ دمشق میں مذکور الفاظ یہ ہیں:

”بوركَ لكَ في الموهوب، وشكرتَ الواهبَ، ورُزقت برّه، وبلغَ أشدَّه۔“

مسند ابن الجعد میں مذکور الفاظ یہ ہیں:

”شَكَرْتَ الْوَاهِبَ، وَبُورِكَ لَكَ فِي الْمَوْهُوبِ، وَبَلَغَ أَشُدَّهُ، وَرُزِقْتَ بِرَّهُ۔“

امام نووی رحمہ اللہ نے الاذکار اور المجموع شرح المھذب میں جو الفاظ ذکر کئے ہیں وہ یہ ہیں:

”بارَكَ اللّٰه لَكَ فِي الْمَوْهُوبِ لَكَ، وشَكَرْتَ الْوَاهِبَ وَبَلَغَ أَشُدَّهُ، وَرُزِقْتَ بِرَّهُ۔“

---

[1] الدعاء للطبرانی، کما فی وصول الأمانی باصول التھانی، صفحہ نمبر: 36، وحسنه محققه

[2] الدعاء للطبرانی، کما فی وصول الامانی باصول التھانی، صفحہ نمبر: 37، وحسنه محققه

بہرحال یہ الفاظ کی تقدیم وتاخیر کے قبیل سے ہے، اس میں معنوی طور پر کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ لہذا کسی بھی الفاظ کو اختیار کر لینا صحیح ہوگا۔

دعائے برکت کی حکمت

مختلف مواقع پر نبی اکرم ﷺ سے مسنون ہے کہ آپ ﷺ نے برکت کی دعا دی ہے بلکہ ترغیب بھی دی اور اس میں بڑی عظیم حکمت پوشیدہ ہے اور وہ یہ ہے کہ اس دعا کی وجہ سے نظر بد کا اندیشہ نہیں رہتا جیسا کہ:

ابوامامہ (اسعد) بن سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ غسل کر رہے تھے کہ عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ گزرے، انہوں نے (سہل کو دیکھ کر) کہا: اس جیسا (خوش رنگ جسم) آج دیکھا ہے، پہلے) کبھی نہیں دیکھا۔ کسی پردہ نشین (کنواری لڑکی) کی جلد بھی ایسی (خوش رنگ) نہیں (ہوتی۔) وہ فورا ہی زمین پر گر پڑے (اچانک تیز بخار ہوا کہ کھڑے نہ رہ سکے۔) انہیں نبی ﷺ کے پاس لایا گیا اور کہا گیا: سہل رضی اللہ عنہ کی خبر لیجئے، وہ تو گر پڑے ہیں (اٹھ بھی نہیں سکتے۔) نبی ﷺ نے فرمایا: "تمہیں اس کے بارے میں کس پر شک ہے؟" لوگوں نے کہا: عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ (کی نظر لگی ہے۔) نبی ﷺ نے فرمایا:

"عَلَامَ يَقْتُلُ أَحَدُكُمْ أَخَاهُ، إِذَا رَأَى أَحَدُكُمْ مِنْ أَخِيهِ مَا يُعْجِبُهُ، فَلْيَدْعُ لَهُ بِالْبَرَكَةِ"

"کیا وجہ ہے کہ ایک آدمی اپنے بھائی میں کوئی چیز دیکھے جو اسے اچھی لگے تو اسے چاہیے کہ اسے برکت کی دعا دے۔"

پھر آپ ﷺ نے پانی منگوایا اور عامر رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وضو کریں، چنانچہ انہوں نے اپنا چہرہ، ہاتھ کہنیوں تک، دونوں گھٹنے، اور تہبند کا اندر کا حصہ دھویا۔ آپ ﷺ نے وہ پانی سہل پر ڈالنے کا حکم دیا۔ [1]

مذکورہ واقعہ کی روشنی میں معلوم ہوا کہ برکت کی دعا دینے کے فوائد میں سے ایک فائدہ یہ ہے کہ نظر بد کا

---

[1] سنن ابن ماجه، حديث :3509، كتاب الطب، باب العين

اندیشہ زائل ہوجاتا ہے۔

خلاصہ کلام

مذکورہ تفصیل کو چند نکات میں درج کیا جاتا ہے۔

بچے کی پیدائش کے موقع پر عام طور پر چار قسم کے کلمات کہے جاتے ہیں۔

1. سیدنا حسن بصری رحمہ اللہ سے منقول کلمات ”بارَكَ اللّٰه لَكَ فِي الْمَوْهُوبِ لَكَ،وشَكَرْتَ الْوَاهِبَ وَبَلَغَ أَشَدَّهُ، وَرُزِقْتَ بِرَّهُ“

2. سیدنا حسن بصری اور ایوب سختیانی رحمہما اللہ سے منقول کلمات ”جَعَلَهُ اللّٰهُ مُبَارَكًا عَلَيْكَ وَعَلَى أُمَّةِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وسلم۔“

یہ دونوں مقطوع آثار ہیں جو کہ تابعین سے مروی ہیں اور دوسرے الفاظ تو صرف برکت ہی کی دعا کے ہیں لہذا یہ مرفوع روایت کے منافی نہیں۔ البتہ ان دونوں دعاؤں کو مسنون سمجھنا یا کہنا بھی صحیح نہیں۔

3. مبارک ہو، مبروک، ایسے کلمات جو برکت کی دعا پر مشتمل ہوں خواہ کلمات کوئی سے بھی ہوں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مطلق طور پر برکت کی دعا پر مبنی روایات کی روشنی میں ایسا کہنا صحیح ہے۔

4. ” بَارَكَ اللّٰهُ لَكِ فِيهِ، وَجَعَلَهُ بَرًّا تَقِيًّا“ یہ مرفوع کلمات ہیں، بنابریں ان کلمات کا انتخاب زیادہ اولیٰ ہے کیونکہ یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان سے جاری مسنون الفاظ ہیں۔

هذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب